سلسلۂ مطبوعات ادارۂ دار الاسلام (۳)

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"
جمال پور، پٹھانکوٹ

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے
محصول ڈاک چھ آنے

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصۂ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت بے جلد ۲ روپے ۸ آنے علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے چار آنے علاوہ محصولڈاک

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصۂ سوم

از

ابوالاعلیٰ مودودی

ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر ترجمان القرآن۔ دارالاسلام جمالپور متصل پٹھان کوٹ

قیمت بے جلد ۲/۱۲ — محصول ڈاک ۴/

(بار سوم دو ہزار)

فہرست مضامین

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن دارالاسلام۔ جمالپور متصل پٹھانکوٹ سے شائع کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اب اسی سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اس تیسرے مجموعہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں یوں محسوس کرے گا کہ میں نے حصہ دوم کی اشاعت کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں۔ لیکن دراصل ان تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقاء ہے جس کی توضیح یہاں کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ناظرین کو کسی قسم کا خلجان پیش نہ آئے۔

یہ بات تھوڑے غور و تامل سے ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا کام کسی نئی تحریک کی ابتداء کرنے کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ نئی تحریک پیش کرنے والے کا راستہ تو بالکل صاف ہوتا ہے۔ اسے صرف اُن لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو اس تحریک سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اس کو محض اپنے اصول و مقاصد کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے۔ پھر یا تو لوگ اس کی دعوت کو رد کر دیتے ہیں یا قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن جو کسی پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنا چاہے اس کے لیے صرف یہی ایک کام نہیں ہوتا کہ بیگانوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرے بلکہ اسے یگانوں پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ وہ ان لوگوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا جو پہلے سے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں اور بہرحال بیگانوں کی بہ نسبت اس سے قریب تر ہیں۔ اس کو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انحطاط کا عمل ان کے اندر کہاں تک ہو چکا ہے اور اصل تحریک کا اثر کس حد تک ان میں باقی ہے۔ پھر اسے یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ جس حد تک بھی وہ دور نکل گئے ہیں اس سے آگے نہ جانے پائیں، اور جو کچھ اثر ان کے اندر باقی

ہے وہ محفوظ رہے۔ ان کی حیثیت اس تحریک کے حق میں بالکل اس سرمایہ کی سی ہوتی ہے جو کسی شخص کے پاس بچا کھچا باقی رہ گیا ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک عقلمند آدمی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس کا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ لہٰذا اس کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ساتھ لوگوں کی وابستگی جیسی کچھ بھی ہر دست ہے اس کو کم از کم اسی حد پر برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور اس کو مزید اضمحلال سے روکے۔ تحفظ کی اس تدبیر میں کسی حد تک کامیاب ہو جانے کے بعد اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ انھیں موجودہ حالت پر بھی نہ ٹھیرنے دے بلکہ اصل تحریک کی طرف اُن کو کھینچنے کی کوشش کرے اور کسی دوسری چیز کو ان کا نصب العین اور ان کی کوششوں کا مرکز و محور نہ بننے دے۔ اتنے مرحلوں سے گزر کر پھر کہیں اس کے لیے دعوتِ عام کا موقع آتا ہے اور وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے ایک نئی تحریک پیش کرنے والے کا کام شروع ہوتا ہے۔

چونکہ میرے پیش نظر تحریکِ اسلامی کا احیاء ہے اس لیے مجھے بھی اُسی تدریج کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ "ترجمان القرآن" کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوئے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو جو شکلیں پیدا ہو گئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روز افزوں بُعد اُن میں پیدا ہو رہا ہے اُسے روکا جائے[1]۔ ابھی یہ کوشش جاری تھی کہ ۱۹۳۷ء میں یکایک یہ خطرہ سامنے آ گیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظام حکومت کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اس کے پنجے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقۂ اثر میں ہیں ان کو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی رابطۂ عوام کی تدبیر وں سے، اور اپنی وردھا سکیم اور ودیا مندر سکیم کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کر لے، اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کر دے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اُتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے۔ اس خطرہ کو اور زیادہ پریشان کن جس چیز نے

---

[1] میری کتاب "تنقیحات" اسی کوشش کا آئینہ ہے۔

بنا دیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ با اثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہو گا۔ لہٰذا اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے میں نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۳۷ء کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۳۹ء کے آغاز میں شائع کیا۔ ان مجموعوں میں میرے پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کر دیں۔ اس لیے میں نے ان کے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی، ان کو اس جمہوری لادینی نظام حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جا رہا تھا، اُن آئینی تحفظات اور "بنیادی حقوق" کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کر کے مسلمان اس مہلک جمہوری دستور کے جال میں پھنسنے کے لیے آمادہ ہو رہے تھے، اور ان کے سامنے "شبہ دار الاسلام" کا نصب العین پیش کیا تاکہ کسی نصب العین کے موجود نہ ہونے سے خیالات اور اعمال کی جو پراگندگی ان کے اندر پیدا ہو گئی ہے وہ بھی دور ہو اور ان کو نظر جمانے کے لیے ایک ایسا مطمحِ نظر بھی مل جائے جو نہ تو اصل اسلامی سمت سے ہٹا ہوا ہو اور نہ اتنا زیادہ بلند ہو کہ اس کی بلندی کو دیکھ کر ان کی ہمتیں پست ہو جائیں۔

اس وقت چونکہ تحفظ کا کام مقدم تھا اس لیے میں نے آزادی، قومیت، قومی تہذیب، حکومتِ خود اختیاری، اقلیت و اکثریت وغیرہ کے متعلق رائج الوقت تصورات کے خلاف کچھ کہنے سے قصداً احتراز کیا، اور ان الفاظ کے جو مفہومات ذہنوں میں راسخ تھے ان کو جوں کا توں قبول کر کے اُسی زبان میں گفتگو کی جس کو لوگ سمجھ سکتے تھے۔ اسی طرح میں نے مطلوبِ اصلی سے بحث کرنے کے بجائے حالتِ واقعی تک اپنی بحث کو محدود رکھنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ دونوں چیزوں کو بیک وقت پیش کرنے سے دماغ پراگندہ نہ ہو جائیں اور ایک ہی چھلانگ میں مقصدِ بعید تک پہنچنے کی کوشش کہیں مقصدِ قریب کے بھی ہاتھ سے جانے کی موجب نہ بن جائے۔

یہ کام جس غرض کے لیے کیا گیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب

اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کردیں گے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں نتھی کرالیں گے جو واحد قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو۔ یہ جو کچھ ہوا کسی انسانی کوشش سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوا۔ اسی کی مہربانی سے متعدد اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی بدولت مسلمان اس خطرے سے بچنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اس سلسلہ میں جن جن لوگوں کو اس نے تھوڑی یا بہت خدمت کی توفیق بخشی ان کے لیے فخر کا مقام نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

اس مرحلہ کے طے ہوجانے کے بعد اب میرے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کو اس نتیجہ پر مطمئن ہوجانے دیا جائے جو حاصل ہوچکا ہے یا ان میں مزید بے چینی پیدا کرکے انھیں اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جائے؟ آیا مسلمانوں کو سیاست و اجتماع کے انھی غلط تصورات میں مبتلا رہنے دیا جائے جو مغربی جاہلیت سے انھوں نے سیکھے ہیں یا ان کے سامنے اسلام کے اجتماعی و سیاسی تصورات کو صرف علمی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک عملی مطمحِ نظر کی حیثیت سے بھی پیش کردیا جائے؟ آیا مسلمانوں کو محض اپنی انفرادیت کے سنبھالنے ہی میں لگا رہنے دیا جائے یا انھیں یہ بتایا جائے کہ تمھاری انفرادیت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے لیے مطلوب ہے؟ یہ سوال سامنے آتے ہی میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ صادر کیا کہ پہلی شق غلط ہے اور صرف دوسری شق ہی صحیح ہے۔ چنانچہ اگر کوئی دوسرا سبب نہ پیش آتا تب بھی مجھے وہ کام کرنا ہی تھا جو میں نے کیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھ دو مزید وجوہ ایسے پیدا ہوگئے جنھوں نے مجھے مجبور کردیا کہ حصۂ دوم کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اُن مضامین کا سلسلہ شروع کردوں جن کا مجموعہ اس وقت ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے:

پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تحریک کے دَور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اُس قدرِ قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے۔ یہ براہِ راست نتیجہ ہے علمائے کرام کی اُس غلط سیاسی روش کا جس پر وہ ابھی تک برابر اصرار کیے چلے جارہے ہیں

ہیں، اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علماء دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا۔ میرے نزدیک یہ صورتِ حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس نئی تحریک کے اندر داعیۂ دینی کے بجائے داعیۂ قومی کو بہت زیادہ کار فرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جز اتنا کم اور قوم پرستانہ جز اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں! اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مستحکم جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے افراد میں بہر حال کوئی ایک مشترک وفاداری پیدا کرنا کافی ہے، خواہ وہ خدا کی وفاداری ہو یا قوم کی یا وطن کی۔ اس لحاظ سے جن لوگوں کو محض جماعتی استحکام مطلوب ہے ان کے لیے تو یہ امر کسی تشویش کا موجب نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں میں خدا کے بجائے قوم کی مشترک وفاداری سے یہ مقصد حاصل ہو، لیکن ہم خدا پر ایمان رکھنے والوں کو آخر کس زمین میں پناہ اور کس آسمان کے نیچے سر چھپانے کی جگہ ملے گی اگر ہم بھی خدا کے ان بندوں کو خدا کے بجائے کسی اور کی مشترک وفاداری پر مجتمع ہوتے دیکھتے رہیں اور کچھ نہ بولیں۔

یہ ہیں وہ محرکات جن کے تحت اس مجموعہ کے مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان مضامین میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں پر اور کہیں کہیں ان کے لیڈروں پر بھی صاف صاف تنقید کی ہے، مگر خدا شاہد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی

سے مجھ کو کوئی ذاتی عداوت نہیں ہے۔ میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے بطلان پر بھی اپنے دلائل بیان کر دیے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے تو میں اپنی رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ کچھ ان کی پارٹی یا ان کی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضبناک ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے کچھ بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل، تو ایسے لوگوں کی اور ان کے غیظ و غضب کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں نہ ان کی گالیوں کا جواب دوں گا اور نہ اپنے طریقہ ہی سے ہٹوں گا۔

ابوالاعلیٰ

تعارفِ مقصد

قوانینِ فطرت سب کے سب بلا استثناء دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ جو آج سے لاکھوں برس پہلے جس قانون کی تابع تھی، اسی کی تابع آج بھی ہے اور اسی کی تابع قیامت تک رہے گی۔ زمانہ کے تغیرات کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ روشنی اور حرارت کے لیے جو قانون دنیا کے ایک حصہ میں ہے وہی دوسرے حصہ میں بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا کہ مشرق میں حرارت کی ماہیت و کیفیت کچھ اور ہو اور مغرب میں کچھ اور، شمال میں روشنی ایک رفتار سے چلے اور جنوب میں دوسری رفتار سے۔ اشیاء کے بننے اور بگڑنے، بڑھنے اور گھٹنے، پیدا ہونے اور فنا ہو جانے کے لیے جو قوانین مقرر ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ ان میں کوئی رعایت، کوئی لاگ لپیٹ، کوئی جانبداری نہیں پائی جاتی۔ فطرت کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ وہ کسی کی دوست اور کسی کی دشمن نہیں۔ کسی پر مہربان اور کسی پر نامہربان نہیں۔ جو آگ میں ہاتھ ڈالے گا، جل جائے گا۔ جو زہر کھائے گا، مر جائے گا۔ جو غذا کھائے گا، قوت اور نشو و نما پائے گا۔ فطرت کے حدودِ فرمانروائی میں یہ ممکن نہیں کہ دیا سلائی کی رگڑ سے ایک کے لیے تو آگ کا شعلہ پیدا ہو اور دوسرے کے لیے پانی کی دھار۔

انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اسی فطرت کا ایک رُخ ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے، لہٰذا انسانی فطرت کے قوانین بھی فطرتِ کائنات کی طرح دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ زمانہ کے تغیرات سے مظاہر میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے، حقائق میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ علم اور وہم میں جو فرق آج سے دس ہزار برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ظلم اور عدل کی جو حقیقت دو ہزار برس قبل مسیح تھی وہی دو ہزار برس بعدِ مسیح بھی ہے۔ جو چیز حق ہے وہ چین میں بھی ویسی ہی حق ہے جیسی امریکہ میں ہے، اور جو چیز باطل ہے وہ کالے کے لیے بھی اسی طرح باطل ہے جس طرح گورے کے لیے ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کے لیے فطرت کا قانون

قطعاً بے لاگ ہے۔ اس میں کسی شخص، کسی قوم، کسی نسل کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ اسباب سعادت اور اسباب شقاوت سب کے لیے یکساں ہیں جو شقاوت کے اسباب فراہم کرے گا وہ محض اس بنا پر سعادت سے ہم کنار نہیں ہوسکتا کہ اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل یا قوم سے ہے۔ اور اسی طرح جو سعادت کے اسباب فراہم کرے گا وہ بھی محض اس بنا پر اپنے کسب کے ثمرات سے محروم نہ رکھا جائیگا کہ وہ فلاں نسل سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں نام سے موسوم ہے۔

فطرت انسانی کے اس دائمی، عالمگیر اور بے لاگ قانون ہی کا دوسرا نام "اسلام" ہے۔ اس کو انسان پر منکشف کرنے والا وہی فاطر کائنات ہے جس نے انسان کی اور سارے جہان کی فطرت بنائی ہے۔ یہ کسی قوم پرست کا تخیل نہیں ہے جو ساری دنیا کو اپنی قوم کے مفاد و مصالح کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ کسی طبقاتی لیڈر کی پرواز فکر بھی نہیں ہے جو سارے معاملات پر ایک طبقہ کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے۔ فی الجملہ یہ کسی انسان کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی خاص عہد کا، کسی خاص ماحول کا اور کسی خاص شخص یا گروہ کی دلچسپیوں کا مقید ہو۔ یہ تو درحقیقت رب العالمین کی ہدایت سے ماخوذ ہے، اور رب العالمین وہ ہے جس کی نگاہ میں سب انسان یکساں ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہے نہ کہ ہندی اور جرمن اور اطالین کی حیثیت سے، یا مزدور اور کسان اور سرمایہ دار کی حیثیت سے۔ اس کو اشخاص اور اقوام سے دلچسپی نہیں بلکہ محض انسان سے ہے۔ اس لیے وہ دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے جتنے اصول بتاتا ہے وہ سب کے سب ہر قسم کی محدودیتوں سے پاک ہیں۔ اُن میں بحیثیت مجموعی تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور زندگی کے ہر مرحلہ میں اُن کی کامیابی مدنظر رکھی گئی ہے۔ وہ فطرت کے تمام دوسرے قوانین کی طرح عالمگیر ہیں۔ ان کا کسی شخص یا قوم کے ساتھ کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے جو کسی دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ نہ ہوسکتا ہو۔ جو کوئی بھی ان اصولوں کو قبول کرکے ان کے مطابق عمل کرے گا، فلاح پائے گا، خواہ رومی ہو یا حبشی، آریہ نسل سے تعلق رکھتا ہو یا سامی نسل سے، امریکہ میں رہتا ہو یا ایشیا میں۔ اور جو ان اصولوں سے انحراف کرے گا، نقصان اٹھائے گا، خواہ وہ کسی پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کے انھی عالمگیر اصولوں پر انسانی حیات کی تعمیر کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جو اسلام کی صداقت پر ایمان لائے، اور چونکہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں اس لیے یہی ہماری تمام کوششوں کا مقصدِ اصلی ہے۔

مگر جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد سب سے پہلے اپنے وطن کو اور بالآخر تمام دنیا کو "دارالاسلام" بنانا ہے تو اس سے ایک ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جس طرح ہر جوشیلا قوم پرست زمین میں اپنی قوم کا غلبہ اور تمکن چاہتا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی قوم کو غالب اور حکمراں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی قوم میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوئے ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوئے ہوتے تو ہٹلر اور گوبرنگ کے رنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوش محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ "دارالاسلام" کو "دارالمسلمین" کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ دونوں میں حقیقتاً بڑا فرق ہے۔ جو لوگ کلمہ گو ہونے کی وجہ سے "دائرۂ اسلام" میں داخل ہیں، اور معاشرت کے اعتبار سے مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں وہ اگر غیر اسلامی طریقوں پر حکومت کریں، تو ان کی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ضرور کہلائے گی کہ اتفاق سے حکمراں کلمہ گو ہیں، مگر ایسی حکومت اسلامی حکومت ہرگز نہ ہوگی اور نہ اس پر صحیح معنوں میں "دارالاسلام" کا اطلاق ہو سکے گا۔ حاشا و کلا، ہمارا نصب العین ایسی "مسلمان حکومت" کا قیام ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حیثیت سے ہم اپنی قوم کی بڑائی چاہیں، اور اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ محض فوجی طاقت سے مسندِ حکومت پر قبضہ کر کے زمین کی دولت اور فرمانروائی کے تکبر کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کرلیں تو خود اسلام ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر ہم کو ظالم اور مفسد ٹھیرائے گا کیونکہ وہ صاف کہتا ہے کہ:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔	آخرت میں عزت کا مقام ہم نے صرف انھی لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں

درحقیقت جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ "مسلمانوں کی حکومت" نہیں بلکہ "اسلام کی حکومت" ہے، اسی اسلام کی

جو مجموعہ ہے دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے عالمگیر اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں ہے۔ اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے اور ان پر عمل کرے وہی اسلام کا علمبردار ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چمار یا بھنگی بھی ہو تو محمد رسول اللہ کی مسندِ خلافت پر بیٹھ سکتا ہے، وہ اگر زنگی یا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفاء اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے جن کے خاندان میں اسلام چلا آرہا ہے وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو شخص ہندو یا عیسائی یا پارسی تھا، شرک اور بت پرستی، شراب اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا، وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر عملاً ان کا پابند ہو جائے تو اس کے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اونچے سے اونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اس مختصر توضیح سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارا مقصد ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری نہیں ہے، بلکہ نظامِ تمدن کو ان اصولوں پر مرتب کرنا ہے جو ہمارے ضمیر و ایمان کے مطابق صحیح ہیں۔ اس پر اگر کوئی ناک بھوں چڑھائے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کے پاس آخر وجوہ اعتراض کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی یا تحقیقی مطالعہ کرکے اس امر کا اطمینان حاصل کرلیتا ہے کہ اس میں انسانیت کی فلاح اور انسانی تعلقات و معاملات کی بہتری کمال درجہ پر موجود ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے، جس سوسائیٹی کے ساتھ اس کی زندگی و موت وابستہ ہے جس حصۂ انسانیت کے ساتھ وہ تمدنی، سیاسی اور معاشی تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، سب سے پہلے اسی کے نظامِ حیات کو اس مسلک کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ اُسے اپنے اس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا، اور اس کے دل میں حُبِّ انسانیت یا حبِّ وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے ابنائے نوع یا ابنائے وطن کو اُس مسلکِ حق کے فوائد سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا جس میں وہ اُن کی فلاح و بہبود اور کامرانی و خوش حالی مضمر دیکھتا ہے، اور اتنا ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ ان مسلکوں کی

حکمرانی کا مخالف ہوگا جن کو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یہ عین انسانی فطرت کا مقتضا ہے اور اس میں کوئی بات خلافِ حبِ وطن (Unpatriotic) نہیں ہے۔ بلکہ خلافِ حبِ وطن تو یہ بات ہو کہ آدمی جس مسلک کو ایمان داری کے ساتھ موجبِ فلاح سمجھتا ہو اس کو خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں یا اپنے گھر میں لیے بیٹھا رہے اور جن طریقوں کو وہ ایمان داری کے ساتھ نقصان رساں سمجھتا ہو انھیں اپنے ابنائے وطن کی زندگی پر مسلط ہونے دے۔

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظامِ تمدن کو مغربی ڈیموکریسی کے نمونہ پر ڈھالیں۔ جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسے برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیرِ نو (Social Reconstruction) مارکسی اشتراکیت کے طریقہ پر ہو۔ یہ آخر کیوں ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی حجت اس کے سوا پیش کی جا سکتی ہے کہ اُن کے ایمان و اعتقاد کا مقتضا یہی ہے؟ کیا ان کے اس اقدام کو کوئی شخص خلافِ حبِ وطن یا خلافِ حبِ انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا ان کے حق میں یہ راستبازی ہوگی کہ وہ جس مسلک کو اپنے ابنائے جنس کے لیے سعادت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اُس کو رائج کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور کسی ایسے نظامِ زندگی کی حکمرانی کو گوارا کر لیں جو اُن کے نزدیک باشندگانِ ملک کو پستی اور بدحالی کی طرف لے جانے والا ہو؟ اگر بالفرض ملک کی آزادی اور اقوامِ عالم کے درمیان اہلِ وطن کی عزت بڑھنے کا امکان کسی شخصی استبدادی حکومت کے قیام یا سرمایہ دارانہ نظام کے بقا ہی میں ہو، تو کیا کسی سچے جمہوریت پسند یا کسی راستباز اشتراکی سے آزادی اور وطن کی عزت کے نام پر اپیل کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مسلکوں کو چھوڑ کر اس طریقہ کو قبول کریں؟ اور کیا ان دونوں کو اس قسم کی اپیل سن کر واقعی ہتھیار ڈال دینا چاہیے؟

بالکل یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔ ہم کو جو چیز "دارالاسلام" کی صدا بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو "جمہوریت" اور "اشتراکیت" کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہم نے بر سوال اسلام کا

تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کیا۔ ہم نے اس کی اعتقادی اساس، اس کے نظریۂ حیات، اس کے اصولِ اخلاق، اس کے نظامِ تمدن، اس کے قوانینِ معاشرت و معیشت، اس کے آئین سیاست و طرزِ حکومت، غرض اس کی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ ہم نے دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدنی مسلکوں کو کھنگال کر دیکھا اور اسلام سے ان کا تقابل کیا۔ اس تمام مطالعہ اور تحقیق و تنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کر دیا کہ انسان کے لیے حقیقی فلاح و سعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہر مسلک ناقص ہے۔ کسی دوسرے مسلک کی اخلاقی بنیاد صالح اور مستحکم نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کے ارتقاء (Development of Personality) کا پورا موقع نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں اجتماعی عدل (Social Justice) اور بین الانسانی تعلقات کا صحیح توازن (Balance) نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں فطرتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کی متناسب رعایت نہیں۔ اسلام کے سوا کوئی مسلک دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو انسان کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرتا ہو، اسے عزت کے بلند ترین مدارج کی طرف لے جاتا ہو، اور ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرتا ہو جس میں ہر شخص اپنی قوت و استعداد (Capacity) کے مطابق اخلاقی، روحانی اور مادی ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنے دوسرے ابنائے جنس کے لیے بھی ایسی ہی ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اطمینان اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے راستبازی کا تقاضا کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند ابنائے جنس کے لیے ہے؟ جس مسلکِ اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ انسانیت کے لیے رحمت سمجھتے ہیں، کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہو جاتا کہ اپنے ملک اور اپنے ابنائے نوع کی اجتماعی زندگی کو اسی مسلک کے مطابق منظم کرنے کی جدوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

اسلام کے متعلق ہماری یہ رائے کچھ اس وجہ سے نہیں کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں، اور اسلام کے حق میں ایک طرح کا پیدائشی میلان رکھتے ہیں۔ اپنے دوسرے رفقاء کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے،

مگر اپنی ذات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت پر میں نے اپنے گردوپیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی، تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح مذہبیت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی فلسفہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حیاتِ قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور ازسرِنو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرتِ محمدی کا مطالعہ تھا۔ اس نے مجھے انسانیت کی اصلی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اس تصور سے مجھے روشناس کیا جس کی بلندی تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے لبرل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے انفرادی حسنِ سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحۂ زندگی (Scheme of Life) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن (Balance) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرامِ فلکی کے قانونِ جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظامِ اسلامی بھی اسی حکیم کا بنایا ہوا ہے جس نے اس جہانِ ارض و سما کو عدل اور حق کے ساتھ بنایا ہے۔

پس درحقیقت میں ایک نومسلم ہوں۔ خوب جانچ کر اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے فلاح و صلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوت اس بات کی طرف ہے کہ آؤ ہم اس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے، انسان پر انسان کی خدائی کو مٹا دیں اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان

کے شرف و عزت ہو، حریت اور مساوات ہو، عدل اور احسان ہو۔

بد قسمتی سے اس وقت ہندوستان میں حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا نام سنتے ہی ایک شخص کا ذہن فوراً ووٹ بڑھانے کی کوشش اور سیاسی غلبہ (Domination) کی خواہش اور اسی قبیل کی بہت سی دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرز حکومت کے قیام نے سیاسی طاقت اور اس کے تمام ضمنی فوائد کو ووٹوں کی کثرت پر منحصر کر دیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی پوزیشن یہاں کچھ ایسی ہے کہ ان کی جانب سے اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوئی کوشش اس شبہ سے نہیں بچ سکتی کہ یہ حوصلہ مند (Ambitious) قوم اب اس راستہ سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان شبہات کو قوت پہنچانے میں خود مسلمانوں کا اپنا بھی کافی حصہ ہے۔ ان کے بہت سے غلط نمائندوں نے تبلیغ تبلیغ کا شور کچھ اس طرح بلند کیا کہ گویا یہ محض ایک سیاسی حربہ ہے جسے اس جمہوری دور میں صرف اس غرض کے لیے استعمال کرنا چاہیے کہ اپنی قلتِ تعداد کے پیچیدہ مسئلے کو حل کیا جائے۔ اس چیز نے اسلام کے راستے میں ایک شدید قسم کا سیاسی تعصب حائل کر دیا ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم یا اور کسی ازم کی تبلیغ کی جائے تو لوگ اس کو محض اس کے ذاتی اوصاف (Merits) کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اگر ان کے دماغ کو وہ اپیل کرتا ہے تو اُسے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر "اسلام ازم" کا نام آتے ہی لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کی ایک ایسی قوم کا مسلک ہے جو پہلے یہاں حکومت کر چکی ہے اور اس جمہوری دور میں قلیل التعداد ہونے کی وجہ سے اپنے ووٹ بڑھانا چاہتی ہے تاکہ نمائندہ مجالس کی نشستوں اور دفتری ملازمت کی کرسیوں پر قبضہ کرے۔ یہ خیال آتے ہی دل و دماغ پر قومی تعصب کے قفل چڑھ جاتے ہیں اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے جانچنے پرکھنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

ہمیں ان حالات کا بڑے صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا، کیونکہ صداقت کی راہ میں ہمیشہ مشکلات حائل ہوتی ہی رہی ہیں، شیطانی راہیں آسان ہوتی ہیں اور حق کی راہ بہرحال موانع سے لبریز رہتی ہے۔ محض صبر،

لگاتار سعی اور خالصتہً لوجہ اللہ کام کرنے سے ہم مسلمانوں کے دل بھی بدل سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل بھی۔ جب ہماری سعی و جہد میں خدا کی خوشنودی اور بنی نوعِ انسان کی خیر خواہی کے سوا کسی دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہوگا تو لوگوں کے دل خود بخود اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ اسلام کسی نسل اور قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ ایک انسانی مسلک ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ویسا ہی عام ہے جیسا ہوا اور پانی کا تعلق سب سے ہے۔ اس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہ جس طرح مسلمانوں کی چیز ہے اُسی طرح تمھاری بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اگر نیکی اور تقویٰ اور قانونِ الٰہی کی اطاعت میں تم نسلی مسلمانوں سے بڑھ جاؤ تو امامت تم کو ملے گی، تقدم اور شرف تم کو حاصل ہوگا، خلافت کے امین تم ہو گے اور نسلی مسلمان پیچھے رہ جائیں گے۔ یہاں برہمنیت اور نسل پرستی نہیں ہے کہ عزت و شرف اور قوت و اقتدار پر کسی خاص گروہ کا دوامی اجارہ ہو۔ یہاں ایک قوم پر دوسری قوم کے غلبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تبلیغِ اسلام کی نوعیت اچھوت ادھار کی سی نہیں ہے کہ ایک قوم محض دوسری قوم کے ووٹ بڑھانے کے لیے اس کی جزو بنائی جائے مگر زندگی کی متاع میں اُسے برابر کا حصہ نہ دیا جائے۔ اسلام میں تو برابر ہی نہیں بلکہ اپنے اوصافِ ذاتی کے لحاظ سے ایک شخص زیادہ کا حصہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں پیدائش کی وجہ سے آدمی اور آدمی میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی شخص کی راہ میں اس کے پیشے یا اس کی قومیت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ تم اپنے کیرکٹر اور اپنے کردار کے زور سے جہاں تک اُڑنے کی طاقت رکھتے ہو اُڑ سکتے ہو۔ فرش سے عرش تک تمھاری ترقی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی کھٹکتا ہے کہ اسلام تیرہ چودہ صدی پہلے کا ایک مذہب ہے، اس کو آج ایک فکری و اخلاقی اور تمدنی و سیاسی تحریک کی حیثیت سے زندہ کرنے کا کونسا موقع ہے؟

جو لوگ دور سے کسی چیز کو محض سرسری نظر ہی سے دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں ان کی رائے عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی غلطی یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔ انھوں نے قرآن کا غائر نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کی زندگی پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔ اس لیے محض قیاسی مفروضات کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اسلام اب سے تیرہ سو برس پہلے کی ایک مذہبی تحریک تھی جو اُس زمانہ کے مخصوص تمدنی حالات میں تو بلاشبہ مفید ثابت ہوئی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں، اس زمانہ کے حالات میں وہ پُرانا مسلک کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔

اس غلط فہمی کے پیدا ہونے اور جڑ پکڑنے میں خود مسلمانوں کے اپنے طرزِ عمل کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ انھوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک (Movement) کے بجائے محض زمانۂ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا۔ حالانکہ ایک سلیم الفطرت آدمی اگر اپنے ذہن سے تاریخی اور سیاسی تعصبات اور پیشگی مفروضات کو نکال کر اسلام کا سائنٹفک مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت بآسانی منکشف ہو سکتی ہے کہ اسلام کسی خاص زمانہ کی مذہبی تحریک نہیں ہے جس کی بنیاد وقتی اور مکانی حالات پر ہو۔ بلکہ یہ ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عام قوانینِ فطری کے ساتھ کامل موافقت (Harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے حالات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، مگر اس کی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے، بہر حال کائناتِ فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا لہٰذا جو فطری اصول طوفانِ نوح کے وقت انسانی زندگی کے لیے مفید تھے وہی اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی مفید ہیں، اور وہی ۳۰۰۰ عیسوی میں بھی منزلِ سعادت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہوں گے۔ تغیر جو کچھ بھی ہوگا ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلنے والے حالات پر ان کے انطباق (Application) میں ہوگا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے، یعنی اصولوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قانون کی اسپرٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظامِ اسلامی کو ایک محرک و متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (Adjust) کرتا رہتا ہے۔

تحریکِ اسلامی کا تنزّل

دنیا میں جب کوئی تحریک کسی اخلاقی یا اجتماعی یا سیاسی مقصد کو لے کر اٹھتی ہے تو اس کی طرف وہی لوگ رجوع کرتے ہیں جن کے ذہن کو اس تحریک کے مقاصد اور اس کے اصول اپیل کرتے ہیں، جن کی طبیعتیں اس کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں، جن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہی تحریک صحیح اور معقول ہے، اور جو اپنے نفس کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کو چلانے اور دنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سوا باقی تمام لوگ جن کی طبیعت کی افتاد اس تحریک کے مقاصد اور اصولوں سے مختلف ہوتی ہے، پہلے ہی اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کے دائرے میں آنے والے لائے نہیں جاتے بلکہ خود آتے ہیں۔ انھیں کوئی چیز مجبور کر کے خواہ مخواہ اس میں داخل نہیں کر دیتی۔ نہ کوئی طاقت انھیں لا کر اس میں چھوڑ جاتی ہے جیسے کوئی کسی اندھے کو جنگل میں لے جا کر چھوڑ دے اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے لایا گیا ہوں، بلکہ وہ اسے جانچ کر، پرکھ کر، سمجھ کر پورے شعور اور کامل قصد کے ساتھ آتے ہیں، اور جب آ جاتے ہیں تو اس کے مقصد کو اپنا مقصد بنا کر کام کرتے ہیں کیونکہ وہی مقصد ان کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اصولوں کو وہ اپنے اصول بنا کر چلتے ہیں کیونکہ ان اصولوں کو صحیح و برحق سمجھ کر ہی وہ اس میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اس تحریک کو چلانا زندگی کا مشن بن جاتا ہے کیونکہ جو چیز اُن سے ان کا پچھلا مسلک و مشرب چھڑاتی ہے اور ان کو اس نئے مسلک کی طرف کھینچ کر لاتی ہے وہ دراصل اُن کے قلب و روح کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہی مسلک حق اور راست ہے۔ دراصل اُس تحریک میں اُن پر حق منکشف ہوتا ہے۔ اُس کا انکشاف ہی اُن کو اُس تحریک کی طرف کھینچتا ہے۔ اور انکشافِ حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو کبھی اُس مقام پر نہیں ٹھہرنے دیتا جہاں وہ اس انکشاف سے پہلے تھا، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اُس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اُسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی تحریک

کی صداقت کے معترف ہو کر اسے قبول کرتے ہیں اُن کی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصولوں کی خاطر دوستیوں اور خونی وقلبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن، اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید وبند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں، ان کے خصائل میں تغیر آجاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی شکل، صورت، لباس، خوراک اور عام طرزِ زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ گرد وپیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتدا یوں ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی ہے جو اسے چلانے کے لیے اُٹھتی ہے۔ اس کے مقاصد اور اس کے اصول خود ہی آدمیوں کی اُس بھیڑ میں سے، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اپنے مطلب کے آدمی چھانٹتے ہیں، اور صرف انہی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے ہیں جنھیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دَور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں ان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد بھی اسی مسلک پر اُٹھے جس کو خود انھوں نے حق پا کر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم، تربیت، گھر کی زندگی اور باہر کے ماحول سے اس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے خیالات، اخلاق، عادات اور خصائل سب کے سب اس مسلک کی روح اور اس کے اصولوں کے مطابق ڈھل جائیں۔ اس میں انھیں ایک حد تک کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک حد تک ہی ہوتی ہے۔ پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی کے ماحول اور خاندانی روایات کو طبائع کے ڈھالنے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے، مگر فطرت، دماغ کی ساخت، مزاج کی پیدائشی افتاد بھی ایک اہم چیز ہے، اور حقیقت

میں دیکھا جائے تو بنیادی چیز یہی ہے۔ فطری طور پر دنیا میں ہر قسم کے آدمی، ہر مزاج، ہر رجحان، ہر ساخت کے آدمی ہمیشہ پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح اس تحریک کے ظہور کے وقت ہر طرح کے آدمی دنیا میں موجود تھے، اور ان سب نے اس کو قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ صرف وہی اس کی طرف کھنچے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اسی طرح بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے پیدا ہوں گے انھیں لامحالہ اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ اُن میں ابوجہل اور ابولہب بھی ہوں گے۔ عمرؓ اور خالدؓ بھی ہوں گے اور ابوبکرؓ بھی ہوں گے۔ جس طرح آزر کے گھر میں ابراہیمؑ حنیف پیدا ہو سکتا ہے اُسی طرح نوحؑ کے گھر میں "عمل غیر صالح" بھی پیدا ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق یہ امر لازمی ہے کہ اس سوسائیٹی سے باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی افتاد اور اپنی طبیعت کے رجحان کے لحاظ سے اس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور خود اس کے اندر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اس کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت کا وہ نظام جو تحریک کے ابتدائی حامی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ اُن کی پوری نئی پود کو ان کے مسلک کا حقیقی تبع بنا دے۔

اس خطرے کے سدِّباب اور تحریک کو اس کے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں:۔

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود ناکارہ نکلیں تکفیر[1] کے ذریعہ سے ان کو جماعت سے خارج کر دیا جائے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعہ سے جماعت میں ان نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو رجحان و ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جن کو اس کے اصول و مقاصد اسی طرح اپیل کریں

---

[1] موجودہ زمانہ کی تحریکوں میں اسی چیز کو Purge سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تمام جماعتیں نامناسب آدمیوں کو اپنے دائرے سے خارج کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ جماعت کے اصولوں سے علانیہ منحرف ہو جانے والوں کو قتل تک کر دیا جاتا ہے۔

جس طرح ابتدائی پیرووں کو انھوں نے اپیل کیا تھا۔

یہ اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ ان دونوں تدبیروں کی اہمیت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام تر نسلی افزائش ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے اور جو لوگ اس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ناکارہ لوگوں کو خارج کرنے میں بھی خونی رشتوں اور معاشرتی تعلقات اور دنیوی مصلحتوں کی خاطر تساہل برتا جاتا ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائشیں نکالی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اُس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کو اتنا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سرے سے اس کے سرحدی نشانات اور امتیازی حدود باقی ہی نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ بھانت بھانت کے آدمی اس جماعت کے دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں جن کو کسی قسم کی مناسبت اس کے مسلک سے، اس کے اصولوں سے اور اس کے مقاصد سے نہیں ہوتی۔

پھر جب جماعت میں اس کے اصولوں سے حقیقی مناسبت رکھنے والے کم اور مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اجتماعی ماحول اور تعلیم و تربیت کا نظام بھی بگڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل پہلے کی نسل سے بدتر اُٹھتی ہے۔ جماعت کا قدم روز بروز تنزل و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُس مسلک کا اور ان اصول و مقاصد کا تصور بالکل ہی ناپید ہو جاتا ہے جن پر ابتدا میں وہ جماعت بنی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر حقیقت میں جماعت ختم ہو جاتی ہے اور محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ نام جو ابتدا میں ایک تحریک کے علمبرداروں کے لیے بولا جاتا تھا، اس کو وہ لوگ استعمال کرنے لگتے ہیں جو اس تحریک کو مٹانے والے، اور اس کے جھنڈے کو سرنگوں کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ نام جو ایک مقصد اور ایک اصول کے ساتھ وابستہ تھا، وہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگتا ہے بلا لحاظ اس کے کہ صاحب زادے کی زندگی کے اصول اور مقاصد اس نام سے کوئی مناسبت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کے ہاتھ

میں پہنچ کر وہ نام اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔ وہ خود بھول جاتے ہیں اور دنیا بھی بھول جاتی ہے کہ یہ نام کسی مقصد، کسی مسلک، کسی اصول کے ساتھ وابستہ ہے، بے معنی و مفہوم نہیں ہے۔

اسلام اس وقت اسی آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے، اور اس کے طرزِ عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور کچھ اصول لے کر اٹھی تھی، اور مسلمان کا لفظ اس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے لیے بنائی گئی تھی۔ تحریک گم ہو گئی۔ اس کا مقصد فراموش کر دیا گیا۔ اس کے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت کھو دینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے، جہاں اس کے اصول توڑے جاتے ہیں، جہاں اسلام کے بجائے غیر اسلام ہوتا ہے۔

بازاروں میں جائیے "مسلمان رنڈیاں" آپ کو کوٹھوں پر بیٹھی نظر آئیں گی اور "مسلمان زانی" گشت لگاتے ملیں گے۔ جیل خانوں کا معائنہ کیجیے "مسلمان چوروں" "مسلمان ڈاکوؤں" اور "مسلمان بدمعاشوں" سے آپ کا تعارف ہو گا۔ دفتروں اور عدالتوں کے چکر لگائیے۔ رشوت خواری، جھوٹی شہادت، جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگا ہوا پائیں گے۔ سوسائٹی میں پھریے۔ کہیں آپ کی ملاقات "مسلمان شرابیوں" سے ہو گی۔ کہیں آپ کو "مسلمان قمار باز" ملیں گے۔ کہیں "مسلمان سازندوں" اور "مسلمان گویوں" اور "مسلمان بھانڈوں" سے آپ دوچار ہوں گے۔ بھلا غور تو کیجیے، یہ لفظ "مسلمان" کتنا ذلیل کر دیا گیا ہے اور کن کن صفات کے ساتھ جمع ہو رہا ہے۔ مسلمان اور زانی! مسلمان اور شرابی! مسلمان اور قمار باز! مسلمان اور رشوت خوار! اگر وہ سب کچھ جو ایک کافر کر سکتا ہے وہی ایک مسلمان بھی کرنے لگے تو پھر مسلمان کے وجود کی دنیا میں حاجت ہی کیا ہے؟ اسلام تو نام ہی اُس تحریک کا تھا جو دنیا سے ساری بداخلاقیوں کو مٹانے کے لیے

اٹھی تھی۔ اس نے تو مسلمان کے نام سے اُن چیدہ آدمیوں کی جماعت بنائی تھی جو خود بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اصلاحِ اخلاق کے علمبردار بنیں۔ اس نے اپنی جماعت میں ہاتھ کاٹنے کی، پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی، کوڑے برسا برسا کر کھال اُڑا دینے کی، حتیٰ کہ سولی پر چڑھا دینے کی ہولناک سزائیں اسی لیے تو مقرر کی تھیں کہ جو جماعت دنیا سے زنا کو مٹانے اُٹھی ہے خود اس میں کوئی زانی نہ پایا جائے جس کا کام شراب کا استیصال ہے وہ خود شراب خواروں کے وجود سے خالی ہو، جسے چوری اور ڈاکہ کا خاتمہ کرنا ہے خود اس میں کوئی چور اور ڈاکو نہ ہو۔ اس کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جنھیں دنیا کی اصلاح کرنی ہے وہ دنیا بھر سے زیادہ نیک سیرت، عالی مرتبہ اور باوقار لوگ ہوں۔ اسی لیے قمار بازی، جعلسازی، اور رشوت خواری تو درکنار، اس نے اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی مسلمان سازندہ اور گویا ہو، کیونکہ مصلحینِ اخلاق کے مرتبہ سے یہ بھی گری ہوئی چیز ہے۔ جس اسلام نے ایسی سخت قیود اور اتنے شدید ڈسپلن کے ساتھ اپنی تحریک اٹھائی تھی، اور جس نے اپنی جماعت میں چھانٹ چھانٹ کر بلند ترین کیرکٹر کے آدمیوں کو بھرتی کیا تھا، اس کی رسوائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ رنڈی اور بھڑوے اور چور اور زانی تک کے ساتھ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگ جائے۔ کیا اس قدر ذلیل اور رسوا ہو جانے کے بعد بھی "اسلام" اور "مسلمان" کی یہ وقعت باقی رہ سکتی ہے کہ سر اس کے آگے عقیدت سے جُھک جائیں اور آنکھیں اس کے لیے فرشِ راہ بنیں؟ جو شخص بازار بازار اور گلی گلی خوار ہو رہا ہو کیا کبھی اس کے لیے بھی آپ نے کسی کو ادب سے کھڑے ہوتے دیکھا ہے؟

یہ تو بہت ذلیل طبقہ کی مثال تھی۔ اس سے اونچے تعلیم یافتہ طبقہ کی حالت اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام ایک نسلی قومیت کا نام ہے اور جو شخص مسلمان ماں باپ کے ہاں پیدا ہوا ہے وہ بہرحال مسلمان ہے خواہ وہ عقیدہ و مسلک اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے اسلام کے ساتھ کوئی دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا ہو۔ سوسائٹی میں آپ چلیں پھریں تو آپ کو ہر جگہ عجیب و غریب قسم کے "مسلمانوں" سے سابقہ پیش آئے گا۔ کہیں کوئی صاحب علانیہ خدا اور رسول کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر ہیں پھر بھی

"مسلمان" ہی۔ ایک دوسرے صاحب خدا اور رسالت اور آخرت کے قطعی منکر ہیں اور کسی مادہ پرستانہ مسلک پر پورا ایمان رکھتے ہیں، مگر ان کے "مسلمان" ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک تیسرے صاحب سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں سنتے، مگر ہیں یہ بھی "مسلمان"۔ ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحبہ یا شریمتی جی بنائے ہوئے سینما لیے جا رہے ہیں، یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحب زادی سے وایولین بجوا رہے ہیں، مگر آپ کے ساتھ بھی لفظ "مسلمان" بدستور چپکا ہوا ہے۔ ایک دوسرے ذاتِ شریف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تمام فرائض سے مستثنیٰ ہیں، شراب، زنا، رشوت، جوا اور ایسی سب چیزیں ان کے لیے جائز ہو چکی ہیں، حلال اور حرام کی تمیز سے نہ صرف خالی الذہن ہیں بلکہ اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں بھی ان کو یہ معلوم کرنے کی پروا نہیں ہوتی کہ خدا کا قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے، خیالات، اقوال اور اعمال میں ان کے اور ایک کافر و مشرک کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا، مگر ان کا شمار بھی "مسلمانوں" ہی میں ہوتا ہے۔ غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا "مسلمان" نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا نظریہ اب یہ ہو گیا ہے کہ "مسلمان" جو کچھ بھی کرے وہ "اسلامی" ہے، حتیٰ کہ اگر وہ اسلام سے بغاوت بھی کرے تو وہ اسلامی بغاوت ہے۔ یہ بینک کھولیں تو اس کا نام "اسلامی بینک" ہو گا۔ یہ انشورنس کمپنی قائم کریں تو وہ "اسلامی انشورنس کمپنی" ہو گی۔ یہ جاہلیت کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ "مسلم یونیورسٹی"، "اسلامیہ کالج" یا "اسلامیہ سکول" ہو گا۔ ان کی کافرانہ ریاست کو "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ان کے فرعون اور نمرود "اسلامی بادشاہ" کے نام سے یاد کیے جائیں گے۔ ان کی جاہلی زندگی "اسلامی تہذیب و تمدن" قرار دی جائے گی۔ ان کی موسیقی، مصوری اور بُت تراشی کو "اسلامی آرٹ" کے معزز لقب سے ملقب کیا جائے گا۔ ان کے زندقے اور اوہام لاطائل کو "اسلامی فلسفہ" کہا جائے گا حتیٰ کہ

سوشلسٹ بھی ہوجائیں گے تو"مسلم سوشلسٹ" کے نام سے پکارے جائیں گے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا ہو چکے ہیں، اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ "اسلامی شراب خانے" "اسلامی قحبہ خانے" اور "اسلامی قمار خانے" جیسی اصطلاحوں سے بھی آپ کا تعارف شروع ہوجائے۔ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کافرانہ چیز کو "اسلامی کفر" یا "اسلامی معصیت" کے نام سے موسوم کرنے میں اب کسی کو تناقض فی الاصطلاح (Contradiction in terms) کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر کسی دُکان پر آپ "سبزی خوروں کی دکان گوشت" یا "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں یا کسی عمارت کا نام "موحدین کا بتخانہ" سنیں، تو شاید آپ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے گی۔

جب افراد کی ذہنیتوں کا یہ حال ہے تو قومی مقاصد اور قومی پالیسی کا اس تناقض سے متاثر نہ ہونا اَمرِ محال ہے۔ آج مسلمانوں کے اخباروں اور رسالوں میں، مسلمانوں کے جلسوں اور انجمنوں میں، مسلمان پڑھے لکھے طبقہ میں آپ ہر طرف کس چیز کی پکار سنتے ہیں؟ بس یہی ناکہ سرکاری ملازمتوں میں ہمیں جگہیں ملیں۔ غیر الٰہی نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے جس قدر پرزے درکار ہیں ان میں سے کم از کم اتنے پرزے ہم پر مشتمل ہوں۔ شریعت ساز مجلسوں (Legislatures) کی نشستوں میں کم از کم اتنا تناسب ہمارا ہو۔ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ میں کم سے کم اتنے فی صدی ہم بھی ہوں۔ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ میں غالب حصہ ہمارا ہی رہے۔ اسی کی ساری چیخ پکار ہے۔ اِسی کا نام اسلامی مفاد ہے۔ اسی محور پر مسلمانوں کی قومی سیاست گھوم رہی ہے۔ یہی گروہ عملاً اس وقت مسلم قوم کی پالیسی کو کنٹرول کر رہا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کو نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اس کی عین ضد ہیں۔ غور کا مقام ہے کہ اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو کیا اس کا نقطۂ نظر یہی ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصلاح کی تحریک اور کوئی ایسی جماعت جو خود اپنے اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو، کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے پیروؤں کو کل پرزے بننے کی اجازت دیتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ اشتراکیوں نے بینک آف انگلینڈ کے نظام میں

اشتراکی مفاد کی حفاظت کا سوال اٹھایا ہو؟ یا فاشسٹ گرانڈ کونسل میں اپنی نمائندگی کے مسئلہ پر اشتراکیت کے بقا و فنا کا انحصار رکھا ہو؟ اگر آج روسی کمیونسٹ پارٹی کا کوئی ممبر نازی حکومت کا وفادار خادم بن جائے تو کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اُسے پارٹی میں رہنے دیا جائے گا؟ اور اگر کہیں وہ نازی آرمی میں داخل ہو کر نازیت کو سر بلند کرنے کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کی جان کی سلامتی کی بھی امید کر سکتے ہیں؟ مگر یہاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اسلام جس روٹی کو زبان پر رکھنے کی اجازت بھی شاید انتہائی اضطرار کی حالت میں دیتا، اور جس کو حلق سے اتارنے کے لیے غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی شرط لگاتا، اور پھر تاکید کرتا کہ جس طرح سخت بھوک کی حالت میں جان بچانے کے لیے سور کھایا جا سکتا ہے اُسی طرح بس یہ روٹی بھی بقدر سد رمق کھا لو۔ یہاں اس روٹی کو نہ صرف هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا کر کے پورے انبساط کے ساتھ کھایا جاتا ہے، بلکہ اسی پر کفر اور اسلام کے معرکے سر ہوتے ہیں، اور اسی کو اسلامی مفاد کا مرکزی نقطہ قرار دیا جاتا ہے! اس کے بعد تعجب نہ کیجیے اگر ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک کی حیثیت سے اسلام کے دعوائے حکمرانی کو سن کر دنیا مذاق اُڑانے لگے۔ کیونکہ اسلام کی نمائندگی کرنے والوں نے خود اس کے وقار کو اور اس کے دعوے کو اپنے معبودِ شکم کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اور دیکھیے۔ آپ کے ہاں ایک صاحب بڑے طنطنہ کے ساتھ ایک نوجی تحریک لے کر اٹھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ تمہاری شوکتِ رفتہ کو پھر تازہ کر دوں گا اور تمہیں زمین میں غلبہ دلوا کر چھوڑوں گا۔ آپ کے ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ لاکھوں ان سے فلاح و کامرانی کی آس لگاتے ہیں۔ آپ کا پریس اِدھر سے اُدھر تک ان کی حمایت کرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے یہ صاحب اسلام کے سپہ سالار اور ملت کے امیر مطاع بن جاتے ہیں۔ مگر آپ میں سے بہت کم لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ اُن کے عقائد، اُن کے فہمِ قرآن، ان کے اخلاق، اُن کی گفتار، اُن کے اعمال، اور ان کے طریقِ کار کا بھی جائزہ لے کر دیکھیں۔ ایک شخص اسلامی اصطلاحات کے پردے میں میکیاویلی، ڈارون، ارنسٹ ہیکل اور کارل پیرسن جیسے لوگوں کے نظریات پیش کرتا ہے، قانونِ طبعی

اور قانونِ شرعی کو خلط ملط کر کے اسلام کی جڑ بنیاد تک اُکھاڑ پھینکتا ہے، ایمان، اسلام، تقویٰ، عبادت توحید، رسالت، جہاد، ہجرت، اطاعت امر، جماعت، سب کے مفہوم بدل کر رکھ دیتا ہے اور تم زہر کے یہ سارے گھونٹ محض اس لالچ میں حلق سے نیچے اُتار جاتے ہو کہ یہ "مسلم قوم" کی عسکری تنظیم تو کر ہی دے گا۔ ایک شخص علانیہ جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ پر اپنی تحریک کی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے، غیر مسلموں تک کے سامنے اپنے کذب و دروغ سے اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرتا ہے، اپنی بدزبانی اور لاف زنی سے مسلمانوں کے قومی اخلاق کی خوب تذلیل و تضحیک کراتا ہے، غیر مسلموں کے مقابلہ پر آکر پہلی ضرب کھاتے ہی معافی مانگتا ہے، پھر اپنے وقار کو بچانے کے لیے علی الاعلان جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے معافی نہیں مانگی، اور پھر لاف زنی کرتا ہوا وہیں لڑنے پہنچ جاتا ہے جہاں اس نے واپس نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ تم یہ سب کچھ دیکھتے ہو اور اس کے باوجود اس کے پیچھے لگے رہتے ہو محض اس امید پر کہ یہ ہمیں دنیوی کامرانیوں سے ہمکنار تو کر دے گا۔ ایک شخص کی تحریر و تقریر اور ایک ایک حرکت سے دنائت، سفلہ پن، اور بازاریت ٹپکی پڑتی ہے، تقویٰ، صداقت اور وقار کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا اور تم اس کی امارت تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ وہ پچاس ہزار مسلمانوں کی جانیں غیر الٰہی حکومت کے لیے بالا پیش کرتا ہے اور اس خدمت گذاری کا فائدہ تمھیں یہ بتاتا ہے کہ اس بہانے تم کو عسکری ٹریننگ مل جائے گی اور تمھاری فوجی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی۔ تم اس ذلیل تدبیر کی خوراک بھی حلق سے اُتار لیتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ ہمیں ایک فوجی تنظیم کرنے والا امیر تو مل گیا۔

یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ تمھارا معیارِ اخلاق و انسانیت کس قدر گر گیا ہے۔ تم جس اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ دنیا میں یہ اصول قائم کرنے آیا تھا کہ انسان کا مقصد ہی صرف پاک ہونا چاہیے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے ذرائع بھی پاک ہونے چاہییں۔ مگر تمھارا حال یہ ہے کہ جس ذریعہ سے بھی تم کو کامیابی کے حصول کی امید نظر آتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ناپاک اور ذلیل ذریعہ کیوں نہ ہو، تم دوڑ کر اُسے دانتوں سے پکڑ لیتے ہو اور جو تمھیں اس سے روکنا چاہے اُلٹا اُسی کو پھاڑ کھانے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ ذرائع کی پاکی و ناپاکی سے قطع نظر کر کے محض کامیابی کو مقصود بالذات بنانا تو دہریوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ اگر مسلمان نے بھی یہی کام کیا

تو اس کی خصوصیت کیا باقی رہی ؟ بلکہ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد دوسری جاہل قوموں سے الگ "مسلمان" کے جداگانہ وجود کے لیے کونسی وجہ جواز رہ جاتی ہے ؟

اور اوپر چلیے۔ آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس، مسلم لیگ ،جس کو نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ذرا اس کو دیکھیے کہ اس وقت وہ کس روش پر چل رہی ہے۔ موجودہ جنگ کے آغاز میں اس نے اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا اور پھر وائسرائے کے اعلان پر جس رائے کا اظہار کیا، اس کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرز عمل ، اور ایک ایسی جماعت کے طرز عمل میں جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لیے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو اول نظر میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے وہ اصول پرستی کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے، تو اس کے آئینے میں ہر صاحب نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام نہاد مسلمانوں پر پوری طرح اخلاقی موت وارد ہو چکی ہے۔ مقامی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو سیاسی پوزیشن اس وقت ہے، اس پوزیشن میں اگر دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اس کی لیگ بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کرتی، اور قریب قریب انہی الفاظ میں اپنا ریزولیوشن مرتب کرتی۔ آپ مسلم کے بجائے سکھ، پارسی، جرمن، اٹالین، جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہی سیاسی موقف اور یہی مقامی حالات اس کے ساتھ وابستہ کر دیجیے، اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ آپ اس ریزولیوشن کو ان میں سے ہر قوم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان اب اسی سطح تک گر گیا ہے جس سطح پر دنیا کی تمام قومیں ہیں۔ ایک موقع و محل پر دنیا کی کوئی کافر و مشرک قوم جو طرز عمل اختیار کر سکتی ہے وہی مسلمان بھی اختیار کر رہا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ میں اولاً اور بالذات ایک اخلاقی اصول کا نمائندہ اور وکیل ہوں، اسی حیثیت سے میرا نام مسلمان ہے، میرا کام سب سے پہلے ایک معاملہ کے اخلاقی پہلو کو دیکھنا ہے، اور میری مسلمان ہونے کی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسی پہلو پر اپنے فیصلہ کا مدار رکھوں۔ اگر میں نے بھی صرف یہی دیکھا کہ پیش آمدہ معاملہ خود مجھ پر اور میری قوم پر کیا اثر ڈالتا ہے ، اور یہ کہ میں

اس صورتِ حال میں اپنے لیے کس طرح فائدہ حاصل کر سکتا ہوں، تو پھر "مسلمان" کے نام سے میرے الگ وجود کی کوئی وجہ باقی ہی نہیں رہتی۔ ایسا طرزِ عمل تو اگر میں نا مسلمان ہوتا اور کسی آسمانی کتاب کی مجھے ہوا بھی نہ لگی ہوتی تب بھی میں اختیار کر سکتا تھا۔

میں اس معاملہ کو ہندوستانی وطن پرست کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ سیاسی حیثیت سے مسلم لیگ کی یہ پالیسی مسلمان نام کی اس قوم کے لیے، جو ہندوستان میں بستی ہے، مفید ہوگی یا مضر۔ میرے لیے جو سوال اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو قوم اس وقت مسلمان کے نام سے پکارے جانے کے باعث دنیا میں اسلام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے اس کی سب سے بڑی مجلس نے دنیا کے سامنے اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے جب میں مسلم لیگ کے ریزولیوشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔ ان لوگوں کو ایک موقع اور نادر موقع ملا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ساری قوموں پر اپنے اخلاقی مرتبہ کی برتری کا سکہ جما دیتے۔ ان کو ایک بیش قیمت موقع ملا تھا اس حقیقت کے اظہار کا کہ ہم ایک اخلاقی اصول کے پیرو کار ہیں، اور وہ اخلاقی اصول حق اور عدل کی پاک ترین روح کا حامل ہے، اور دنیا میں صرف ہماری جماعت ہی وہ ایک جماعت ہے جو شخصی یا قومی نفع و نقصان کے تصورات سے بالاتر ہو کر مجرد اخلاق کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ اگر لیگ کے رہنماؤں میں اسلامی حس کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ دیتے۔ اور اس کا جو گہرا اخلاقی اثر مرتب ہوتا، اس کی قدر و قیمت کے مقابلہ میں کوئی نقصان جو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے کی توقع ہے، قطعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہے جیسی دنیا میں دوسری اور قومیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چال اور ہر مفیدِ مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر دینا ہی بس "اسلامی سیاست" ہے ـــــ

حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے لیے ازالہ حیثیت عرفی سے کم نہیں!

"مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف پہلوؤں سے یہ چند مثالیں جو میں نے پیش کی ہیں، یہ سب ایک ہی نتیجہ کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اس وقت تنزل و انحطاط کے اس آخری مرحلے پر پہنچ گئی ہے جہاں ایک تحریک کی روح ناپید ہو جاتی ہے، صرف اس کا نام باقی رہ جاتا ہے، اور اس نام کا اطلاق، برعکس نہند نام زنگی کافور کے بمصداق، اُن چیزوں پر ہونے لگتا ہے جو اس کے اصل معنی کی ضد ہوتی ہیں۔ نظریات غیر اسلامی اور نام اُن کا مسلمان۔ مقاصد غیر اسلامی اور ان کا نام بھی مسلمان۔ سیرت غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان چسپاں۔ رویہ غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان کا بے تکلف اطلاق۔ افراد سے لے کر جماعتوں تک، سوسائٹی کے ادنیٰ ترین طبقوں سے لے کر بلند ترین طبقوں تک، چھوٹی انجمنوں سے لے کر بڑی سے بڑی مجلسوں تک، ہر طرف اسی ایک وبائے عام کے اثرات پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے دل نے بارہا یہ سوال کیا ہے کہ اسلام جو کبھی آندھی اور طوفان کی طرح اٹھا تھا، جس کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکتی تھی، آج اس کی کشور کشائی اور عالمگیری آخر کس چیز نے چھین لی؟ اس کا جواب ہر بار مجھے یہی ملا کہ اسلامی تحریک پر تنزل و انحطاط کے اُسی قانون کا عمل جاری ہوا ہے جسے میں ابتدا میں بیان کر آیا ہوں۔ اب اصلاح کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو از سر نو ایک تحریک کی حیثیت سے اُٹھایا جائے اور مسلم کے معنی کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ مُردوں کی اس بستی میں جو تھوڑے بہت مسلمان دل ابھی حرکت کر رہے ہیں، اور جن کی گہرائیوں سے ابھی تک یہ ندا دت بلند ہو رہی ہے کہ اسلام ہی حق اور صدق ہے اور انسانیت کی فلاح صرف طریق اسلامی ہی میں ہے، ان کو جان لینا چاہیے کہ اب کرنے کا کام یہی ہے —— مگر اس کام کو کرنا کھیل نہیں ہے۔ یہ وہ کوہ کنی ہے جس کے تصور ہی سے فرہاد کا زہرہ آب ہو جاتا ہے۔

نسلی مسلمانوں کے لیے دو راہیں

عمل، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، بہر حال اس کی صحت کے لیے دو چیزیں شرط لازم ہیں:

پہلی شرط خودشناسی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ آپ کیا ہیں، اور جو کچھ آپ ہیں اس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر اگر اس تحقیق سے آپ پر کوئی ایسی حقیقت منکشف ہو جس سے آپ راضی نہ ہوں، یعنی آپ کی خواہش یہ ہو کہ جو کچھ آپ ہیں وہ نہ رہیں بلکہ کچھ اور ہو جائیں، تب بھی آپ کے لیے لازم ہے کہ اس "کچھ اور" کا تعین کریں اور جو کچھ بھی آپ ہونا چاہتے ہیں اس کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

دوسری شرط قوت فیصلہ اور قوتِ ارادی ہے۔ آپ کو بہر حال یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو کچھ آپ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، یا کچھ اور بننے کے خواہشمند ہیں۔ پھر اس فیصلہ کی رو سے جو کچھ بھی آپ ہونا چاہیں، اس ہونے کے مقتضیات کا بار اٹھانے کے لیے آپ کو تیار رہنا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر خطرناک بات کسی شخص یا گروہ کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک پوزیشن سے محبت اور دوسری پوزیشن کا لالچ رکھتا ہو، کبھی اس پوزیشن سے چمٹ جائے اور کبھی اس پوزیشن کی طرف لپکے۔ مگر دونوں میں سے کسی ایک کے مقتضیات بھی پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس تلون اور تردد کا لازمی نتیجہ خام کاری ہے۔ جو شخص یا گروہ اس حالت میں مبتلا ہو وہ بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ثبات اور قرار نہیں ہوتا۔ اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک پتہ جو زمین پر پڑا ہو اور ہواؤں کے جھونکے اسے اڑائے اڑائے لیے پھریں۔

مسلمانوں کے افراد اور ان کی جماعتوں کے اعمال میں تلون اور خام کاری کی جو کیفیات ایک مدت سے نمایاں ہیں اور اب نمایاں تر ہو گئی ہیں ان کے اسباب پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ تمام خرابیوں کی جڑ انہی دو چیزوں کا فقدان ہے۔ کہیں خودشناسی مفقود ہے اور کہیں قوتِ فیصلہ

د قوتِ ارادی۔

ایک معتد بہ جماعت ہم میں ایسی ہے جو سرے سے اپنی خودی کا احساس ہی نہیں رکھتی۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر بھلا اس سے یہ امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ اپنے انفرادی یا اجتماعی عمل کے لیے وہ کوئی ایسا راستہ منتخب کرے گی جو مسلمان کو کرنا چاہیے؟

ایک دوسری جماعت اور وہ بھی معتد بہ، ایسی ہے جو شعورِ ذات تو رکھتی ہے مگر قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی نہیں رکھتی۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں، اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو کچھ ہم ہیں اس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں، لیکن اس علم نے ان میں محبت اور خوف کے دو گونہ جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ جو کچھ یہ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں کیونکہ انھیں اپنی حیثیت سے محبت ہے، لیکن جو کچھ یہ ہیں اس ہونے کے مقتضیات کی دہشت ان پر طاری ہوگئی ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ مسلمان ہونا کھیل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ذمہ داریوں کا ایک بھاری بوجھ آتا ہے۔ اس کے ساتھ پابندیاں ہیں۔ ایثار اور قربانی ہے۔ جہاد اور مشقت ہے۔ ایک ایسا سخت مشن ہے جس میں دنیا بھر سے لڑائی ہے اور اس لڑائی کے معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا کسی چیز کی طلب بھی جائز نہیں۔ اس ہولناک چیز کا خوف ان کے دلوں پر ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ یہ مسلمان ہونے کے مقتضیات سے کترا کر بھاگتے ہیں، اور کوئی ایسی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں آسانی ہو۔ مگر انھیں خود بھی معلوم ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت باقی رکھ کر یہ کوئی دوسری حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی قوتِ فیصلہ جواب دے گئی ہے۔ یہ اسلام اور کفر کے درمیان متردد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسلام سے چمٹنا چاہتے ہیں مگر اس کے مقتضیات کا خوفناک چہرہ دیکھ کر دور بھاگتے ہیں۔ کفر کی آسائشوں اور لذتوں اور فائدوں کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتے ہیں، مگر وہ کہتا ہے کہ میری طرف آتے ہو تو پورے کافر بن کر آؤ اور میرے مقتضیات پورے کرو۔ یہ اس کے لیے بھی تیار نہیں۔ لہذا اس سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ اب ان کی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو کر رہ گئی ہے جو ہر طرف آسائشیں اور فائدے ڈھونڈتا ہو، مگر کسی طرف کی بھی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

مسلمانوں کی جماعت زیادہ تر انہی دو گروہوں پر مشتمل ہے، اس لیے عموماً جو اجتماعی تحریکیں مسلمانوں میں پھیل رہی ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں۔ ان کے مقاصد میں غلطی ہے۔ ان کے طریقِ کار میں غلطی ہے۔ ان کی قیادت میں غلطی ہے، اور ان کی روحی کیفیت میں غلطی ہے۔ بہت سے لوگوں کو تو بے شعوری کی وجہ سے اس غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا اس لیے وہ جوش و خروش کے ساتھ ان تحریکوں کو چلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی تحریک کے درست ہونے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ اس میں "مسلمان کا فائدہ" ہے۔ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ اور بہت سے لوگ جن کو غلطی کا احساس ہے وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی کمزوری کے باعث ان تحریکوں کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ ان کے نفس نے انھیں یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان ایک بین بین راہ چلنے ہی میں سلامتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان کوئی بیچ کی راہ نہیں ہے اور ایسی کسی راہ پر چل کر مسلمان کہیں کے بھی نہیں رہتے۔ لہٰذا مسلمانوں کی حقیقی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے سامنے واضح طور پر اسلام اور جاہلیت کی راہوں کو ان کے مقتضیات اور ان کے نتائج کے ساتھ کھول کر پیش کر دیا جائے، اور انھیں مشورہ دیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔

میں نے ترجمان القرآن میں "قوم" اور "جماعت" کے اصولی فرق کی بحث اسی توضیح کے لیے چھیڑی تھی۔[1] اس بحث میں میں نے قرآن اور حدیث کی شہادت سے یہ ثابت کیا تھا کہ "مسلمان" کی اصطلاح جس گروہ کے لیے وضع کی گئی ہے، وہ دراصل ایک "قوم" نہیں ہے بلکہ ایک "جماعت" ہے۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "قوم" ہونے اور "جماعت" ہونے کے مقتضیات و نتائج میں کیا فرق ہے۔ مجھے اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں کہ آپ کو قوم کے بجائے جماعت بننے پر مجبور کرے۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ جو چاہیں بنیں۔ البتہ جو خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن کی الجھن اور نظر کے دھند کو دور کر دیں، تاکہ آپ دونوں حیثیتوں کا صحیح موازنہ کر لیں اور آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ ان حیثیتوں کے جمع کرنے کی جو صورتیں آپ نکال رہے ہیں یہ اصولاً غلط اور

[1] ملاحظہ ہو "تفہیمات" جلد اول، مضمون "اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم"۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مسئلۂ قومیت"۔

نتائج کے اعتبار سے مہلک ہیں۔

ایک گروہ میں قومیت کا احساس دراصل تاریخی اثرات اور تہذیبی وراثت کے تسلسل سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب کچھ لوگ ایک طویل مدت تک ایک قسم کے اخلاقی تصورات اور ایک قسم کے معاشرتی طور طریقوں کے ساتھ باہم متفق اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس ورثہ کو لے کر اپنے اندر مستحکم کرتی چلی جاتی ہے، تو ان میں اپنے مستقل اجتماعی وجود کا وہ احساس پیدا ہو جاتا ہے جسے "قومیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چند عادتیں اور رسمیں ہوتی ہیں جن سے وہ مانوس ہوتے ہیں۔ چند تخیلات ہوتے ہیں جن سے انھیں محبت ہوتی ہے اور جن کی ترجمانی ان کا لٹریچر کیا کرتا ہے۔ انہی چیزوں کے مجموعہ کو ان کی کلچر کہا جاتا ہے۔ ان میں طبعاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کلچر یعنی اسلاف کے اس ورثہ کو باقی رکھیں اور اپنے اخلاف کے لیے چھوڑ جائیں تاکہ ان کی قومی زندگی کا تسلسل قائم رہے۔

اس معنی میں جو گروہ ایک قوم بن گیا ہو اس میں قومیت کا شعور پیدا ہونے کے بعد طبعی طور پر یہ خواہش ابھر آتی ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کا ضبط اس کے اپنے ہاتھ میں ہو اور کسی دوسرے گروہ کی مرضی اس پر مسلط نہ ہونے پائے۔ یہ اس گروہ کا سیاسی مفاد ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ معیشت کے جو وسائل اس کے پاس ہیں ان کی حفاظت کرے، اور جو مزید وسائل حاصل ہو سکتے ہوں انھیں حاصل کرے تاکہ اس کے افراد زیادہ سے زیادہ خوش حال ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو معاشی مفاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ قومیت کا یہ مفہوم جو اوپر بیان ہوا ہے، اس کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان صدیوں کے توارث کی بدولت ایک قوم بن چکے ہیں، اور اب دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز وہ اپنا ایک مستقل اجتماعی وجود رکھتے ہیں۔ اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دوسرے گروہوں کی ایک کثیر تعداد کے درمیان گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے ان کے سیاسی اور معاشی مفاد، اور ان کی کلچر کے تحفظ کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔

جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت بس یہی ہے؟ کیا وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم ہیں؟ کیا ان کی قومیت کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ ایک گروہ نے نسلاً بعد نسلٍ ایک طرح کی زندگی بسر کر کے اپنے اندر "قومیت" پیدا کر لی ہے؟ کیا وہ کلچر جسے یہ اسلامی کلچر کہتے ہیں، محض موروثی عادات و رسوم اور تاریخی تجارب کا مجموعہ ہے؟ کیا ان کے اصل قومی مسائل صرف یہی ہیں کہ جس ورثہ کو انھوں نے باپ دادا سے پایا ہے اس کی حفاظت کریں، جن وسائل معیشت اور جن سیاسی اقتدارات پر وہ ابھی تک قابض ہیں انھیں ہاتھ سے نہ جانے دیں، جن چیزوں کی انھیں اپنے گروہ کے افراد کی خوش حالی کے لیے ضرورت ہے، ان کو حاصل کر لیں، اور فی الجملہ ان کی اجتماعی زندگی کا ضبط ان کے اپنے ہی ہاتھ میں رہے؟

اگر یہی مسلمانوں کی قومیت اور یہی ان کی کلچر ہے، اور یہی اُن کے قومی مسائل ہیں تو بلاشبہ وہ سب قومی تحریکات درست ہیں جو اس وقت ان میں چل رہی ہیں۔ اس صورت میں:

ان کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ان کی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظام معاشرت سے وابستہ ہیں۔ انہی کے گروہ کے کچھ لوگ ان کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر یہ حرکت کریں۔ اور ان کی تمام جد و جہد کا مقصود صرف یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے، اور جو کچھ مزید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے۔ قطع نظر اس سے کہ اسلام، جس کے نام پر یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں، اس کو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔ ان کے لیے تمامتر اہمیت صرف اسی ایک چیز کی ہونی چاہیے کہ ملک کا نظم و نسق خواہ کسی نوعیت کا ہو، بہرحال اس کے ضبط میں خود ان کے اپنے افراد کو کافی حصہ ملے تاکہ اپنے آبائی ورثہ (یعنی اپنی کلچر) کو وہ خود جس صورت میں بھی باقی رکھنا چاہیں، رکھ سکیں، اور جس قسم کے بھی فوائد و منافع ملک کی آبادی میں تقسیم ہو رہے ہوں اُن میں سے ایک معتد بہ حصہ ان کے افراد کو بھی مل جائے۔

ان کے لیے یہ بھی درست ہے کہ موقع اور محل کو دیکھ کر یہ ملک کی جس پارٹی[1] کے ساتھ جن شرائط پر چاہیں معاملہ کرلیں، بشرطیکہ اس معاملہ میں ان کے اپنے گروہ کا فائدہ منصور ہو۔ ایسے کسی معاملہ میں قومی غداری کا سوال صرف اس وقت پیدا ہوگا جب معاملہ جان بوجھ کر نقصان کے ساتھ کیا جائے، یا اس میں اپنی قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کو نظر انداز کردیا جائے۔

ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ جس طرح دوسری قوموں میں قوم پرستی (نیشنلزم) پیدا ہوئی ہے اسی طرح ان میں بھی ہو۔ یہ بھی اٹلی اور جرمنی اور جاپان کی طرح غلبہ اور تمکن فی الارض کا مطالبہ کریں۔ ان کی تنظیم بھی فاشستی اصولوں پر کی جائے۔ یہ بھی انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح کے قانون کے مطابق اپنے آپ کو بھیڑیے کی طرح "صالح" ثابت کریں اور غیر صالح بکریوں کو ہضم کرنا شروع کردیں۔ یہ بھی امپیریلسٹ قوموں کے زمرے میں شامل ہوجائیں، جس طرح ممکن ہو زمین میں غلبہ حاصل کریں۔ اور اسی دنیا کی زندگی میں اسی زمین پر اپنے لیے جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کا لطف پیدا کرلیں۔

قومیت کا یہ نظریہ اختیار کرلینے کے بعد آپ کے لیے یہ سب کچھ درست ہوجاتا ہے۔ مگر خوب جان رکھیے کہ اسلام کو اس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام کو نہ تو کسی نسلی گروہ سے دلچسپی ہے۔ نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات اور رسوم سے لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کردے۔ نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقاء کے میدان میں اتریں اور انتخاب طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے۔ لہٰذا اگر یہ آپ کی قومیت اور یہ آپ کی کلچر ہے، اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں، تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا

[1] خواہ وہ کانگریس پارٹی ہو یا سوشلسٹ پارٹی یا کوئی اور۔

آپ کو حق نہیں ہے، کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور اس کلچر سے تبری کرتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ہی کا نام استعمال کرنے پر آپ کو اصرار کیوں ہو؟ "مسلمان" کے معنی ومفہوم سے تو آپ کو کوئی بحث ہے ہی نہیں۔ آپ کو تو اپنی قومیت کے لیے بس ایک نام چاہیے۔ سو اس غرض کے لیے آپ جو نام بھی وضع کر لیں گے وہ آپ کی مستقل اجتماعی حیثیت پر اُسی طرح دلالت کرنے لگے گا جس طرح اب لفظ "مسلمان" کر رہا ہے۔ آخر اس نوع کی قومیت میں کونسی خصوصیت ہے جس کے لیے لفظ "مسلمان" ہی استعمال کرنا ضروری ہو۔

اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اسی لیے نہیں ہے کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اصولاً اسلام کے خلاف ہیں۔ بلکہ اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لیے رسوائی وبدنامی کا موجب ہوگا۔ دنیا آپ کی حرکات کو دیکھ کر سمجھے گی کہ اسلام ایسا ہی کچھ سکھاتا ہوگا، اور یہ چیز اس کو اسلام سے اور زیادہ دور پھینکے گی۔ آپ اپنے "قومی مفاد" کی حفاظت کے لیے غیر اسلامی فوج میں اپنا تناسب قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اور دنیا یہ سمجھے گی کہ شاید یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ جو تمہیں پندرہ روپے تنخواہ دے اس کے حکم سے تم ہر ایک کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ اپنے قومی مفاد کی خاطر ہر اُس منفعت کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کریں گے جو کسی مسلمان یا بہت سے مسلمانوں کو کسی طور سے حاصل ہو یا ہو سکتی ہو، اور دنیا اس دنائت کو اسلام کی طرف منسوب کرے گی۔ آپ انتہائی بے اصولی کے ساتھ کہیں ایک چیز کی حمایت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے مطابق ہے، اور کہیں اُسی چیز کی مخالفت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے خلاف ہے، کبھی ایک پارٹی سے ملیں گے اور کبھی اُسی پارٹی سے لڑیں گے، نہ اس لیے کہ آپ کے اور اس کے درمیان اصولی اتفاق یا اتحاد ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ آپ کے پیشِ نظر اصول نہیں "قومی مفاد" ہے۔ یہ ابن الوقتی جو آپ کے کیرکٹر سے ظاہر ہوگی، دنیا سمجھے گی کہ ایسا ہی کیرکٹر اسلام پیدا کرتا ہے۔ آپ قومی مفاد کی تلاش میں ہر طرف

لیکیں گے، فاشزم کے اصول یا کمیونزم کے نظریات بھی اختیار کریں گے۔ ظالمانہ سرمایہ داری اور مستبدانہ شخصی ریاستوں کے دامن میں بھی پناہ لیں گے، انگریز اور ہندو اور ریاستہائے ہند جس کے آستانہ پر بھی فائدہ کا بُت بیٹھا نظر آئے گا اسی کی طرف سجدہ ریز ہوں گے، اور یہ سارے داغ آپ کے توسط سے اسلام کے دامن پر لگتے چلے جائیں گے۔ اسلام نے صدیوں آپ پر جو احسانات کیے ہیں اُن کا کم از کم یہ بدلہ تو نہ ہونا چاہیئے کہ آپ اس طرح اس کی رسوائی کا سامان کریں۔

لیکن اگر آپ کو اسلام سے واقعی محبت ہے اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جان لینا چاہیئے کہ اسلام یہودیت اور ہندوازم کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسلی قومیت بناتا ہو۔ بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے۔ ایک جہانی نظریہ (World Theory) اور ایک عالمی تصور (Universal Idea) ہے۔ وہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس مسلک، اس نظریہ، اس تصور کو لے کر اُٹھے، اور دنیا کے سامنے عملاً اس کا نقشہ پیش کرے، اور جس جس قوم کے جو جو لوگ اس کو قبول کرتے جائیں انھیں اپنی جماعت میں شامل کرتی چلی جائے، یہاں تک کہ قوموں کے درمیان تفریق کی دیواریں مسمار ہو جائیں۔ اس کے نزدیک "اسلامی" صرف وہ چیز ہے جو اس کے مسلک اور اس کے نظریہ کے مطابق ہو، اور جو چیز اس کے خلاف ہو اس کو وہ اپنانے سے صاف انکار کرتا ہے خواہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ذاتی مفاد اس سے وابستہ ہو۔ لہٰذا اگر آپ اسلام کے مسلک کی خاطر جییں اور اس کو دنیا میں حکمراں بنانے کے لیے جدوجہد کریں تب تو یقیناً آپ اسلامی جماعت اور مسلمان گروہ ہوں گے، ورنہ اپنے لیے جینے اور اپنے مفاد کے لیے جدوجہد کرنے کی صورت میں اسلام سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ آپ کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ کام اپنے لیے کریں اور نام اسلام کا لیں۔

مسلکِ اسلام کی اس جہانی و عالمی نوعیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک عالمگیر مسلک اور جہانی نظریہ کے مقتضیات کیا ہوتے ہیں۔

اولاً وہ مختلف پارٹیوں میں سے ایک پارٹی بن کر رہنے پر قانع نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی فطرت کا اقتضاء یہ ہوتا ہے کہ بس وہی ایک ہو۔ وہ مقابل کی کسی طاقت کو اپنا شریک وسہیم بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مدارات اور مصالحت (Compromise) کرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ وہ سودا نہیں کرتا بلکہ غالب ہونا چاہتا ہے لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

ثانیاً وہ اشخاص یا طبقوں یا قوموں کے نقطۂ نظر سے مسائل کو نہیں دیکھتا بلکہ کلی اور جہانی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے اس امر سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اس شخص یا اس طبقہ یا اس گروہ کا فائدہ کس چیز میں ہے۔ اس کو انسان سے بحث ہوتی ہے، اور وہ ان مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے جو مجموعی حیثیت سے انسان کے لیے حل طلب ہوں قطع نظر اس سے کہ کس کو کیا ملتا ہے اور کس سے کیا چھنتا ہے کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔

ثالثاً اس کے پیشِ نظر وقتی یا مقامی مقاصد نہیں ہوتے بلکہ ایک دائمی اور جہانی مقصد ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کا جو نظام اس کے اصول کے خلاف قائم ہے اس کو توڑ ڈالے اور اپنے اصول کے مطابق مستقل طور پر ایک نظام قائم کرے۔

رابعاً وہ ایسی قومیت کے تنگ دائرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو نسلی اور تاریخی روایات پر قائم ہو۔ اس کی کامیابی کے لیے تو لازمی شرط یہی ہے کہ اپنے عہد کے تمام انسانوں میں سے بہتر اور صالح تر افراد کو نکال کر اپنی تنظیم کی طرف کھینچ لائے اور ان کی قابلیتوں سے کام لے۔ اگر وہ کسی خاص قوم کی ذاتی اغراض کا حامی بن جائے تو ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کے لیے اس کا اپیل قطعاً غیر مؤثر ہو جائے گا۔

خامساً وہ کسی خاص قوم کی موروثی کلچر اور روایتی رسوم و عادات سے اپنا دامن نہیں باندھتا بلکہ ہر عہد میں تمام عالم انسانی نے اپنی علمی تلاش و جستجو سے جو حقائق — نظریات نہیں بلکہ حقائق —

دریافت کیے ہوں، یا اپنی سعی و عمل سے جو صالح نتائج پیدا کیے ہوں، ان سب کو لے کر وہ اپنے تجویز کردہ نظامِ اجتماعی میں اپنے اصول کے مطابق اس طرح جذب کرتا ہے کہ وہ اس نظام کے فطری اجزاء (نہ کہ درآمد شدہ اشیاء) بن جائیں۔

سادساً اس کی کامیابی کے لیے صرف یہ ثابت کر دینا کافی نہیں ہوتا کہ وہ بجائے خود برحق ہے اور اس میں انسان کے لیے فلاح ہے۔ بلکہ اپنے مقصود کو پہنچنے کے لیے وہ اس امر کا اقتضاء کرتا ہے کہ اس کے اصولوں کو ایک جنگ آزما تحریک کی بنیاد بنا دیا جائے، اس پر ایمان رکھنے والے اس تحریک کے زور سے ایک مجاہد جماعت بن کر اُٹھیں، اور بالآخر اس کے نظریات ایک اسٹیٹ کے لیے بنیادی قانون بن جائیں۔

یہ اسلام کے مقتضیات ہیں اور یہی مسلمان ہونے کے مقتضیات بھی ہیں۔ اب اگر آپ "اسلامی جماعت" بن کر کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی اُس قومی پالیسی پر نظر ثانی کرنی ہوگی جس پر آپ اب تک چلتے رہے ہیں، اور اُسے بالکلیہ بدل کر اُن مقتضیات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

آپ کو اپنے دماغ سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑیگا اور اس کی جگہ اسلام کے اصول اور اس کے نصب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو وقتی اور مقامی مقاصد سے صرفِ نظر کر لینا ہوگا اور اپنی نظر اِس ایک مقصد پر جما دینی ہوگی کہ اسلام کے اصول دنیا میں حکمراں ہوں۔ اس غرض کے لیے آپ کو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار ہونا پڑے گا اور کسی ایسی پارٹی سے جو آپ کے اصول نہ مانتی ہو، آپ کسی شرط پر بھی سودا نہ کر سکیں گے۔ آپ کو سختی کے ساتھ ایک با اصول جماعت بننا پڑے گا، ان ناکارہ لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا جو آپ کے اصولوں کو نہ مانتے ہوں، اور سب قوموں میں سے اُن صالحین کو چن چن کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا جو ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو ابن الوقتی چھوڑ دینی ہوگی۔ اپنے اصولوں سے ہٹ کر آپ کچھ نہ کر سکیں گے خواہ اس میں کتنا ہی بڑا شخصی یا قومی فائدہ ہو۔ آپ کو ایک ایسی مجاہد جماعت

بنانا پڑے گا جو اپنے اصولوں کے لیے لڑنے والی ہو جس کا مقصد اپنی "قومی حکومت" (National State) قائم کرنا نہ ہو، بلکہ اپنے "اصولوں کی حکومت" (Ideoiogical State) قائم کرنا ہو۔

ایسی جماعت جب آپ بنیں گے تو آپ کو اپنی قیادت میں تغیر کرنا ہو گا۔ اُس وقت آپ کے قائد صرف وہ لوگ ہو سکیں گے جو اسلام کے اصول کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں اور سب سے زیادہ ان کا اتباع کرنے والے ہوں۔ ایک قوم کا لیڈر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو قوم کا فرد ہو۔ مگر ایک جماعت کا لیڈر صرف وہی ہو سکتا ہے جو جماعت کے مسلک کا سب سے بڑا علمبردار ہو۔ قومی تنظیم میں تو اسلام کے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگ صف اول میں بھی جگہ پا سکتے ہیں مگر جماعتی تنظیم میں ان کا مقام سب سے پیچھے کی صفوں میں ہو گا۔ بلکہ شاید ان میں سے بہتوں کو کسی صف میں بھی جگہ نہ ملے گی۔

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ آپ پر دونوں راستے واضح ہو چکے ہیں۔ اب اُن کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے بھی دیکھ لیجیے تاکہ انتخاب اور اختیار میں آسانی ہو۔

اگر آپ محض ایک ایسی قوم ہوں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہو، تو آپ کی حیثیت ایک جامد چٹان کی سی ہو گی، اور آپ کے مقابلہ میں دوسری بہت سی قومیں ایسی ہی چٹانوں کی صورت میں موجود ہوں گی۔ آپ کا اور اُن کا مقابلہ اُسی طرح ہو گا جس طرح چٹانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ ایک چٹان دوسری چٹان میں سے اجزا لے کر اپنا حجم نہیں بڑھا سکتی۔ نہ ایک چٹان دوسری چٹان کے حیز میں گھس سکتی ہے۔ ان کے درمیان معاملہ کی بس دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ہر ایک چٹان اپنے اپنے حیز میں رہنے پر قانع ہو۔ یا ایک چٹان دوسری چٹان پر چڑھ جائے اور اس سے ٹکرا کر اسے توڑنے اور پیسنے کی کوشش کرے۔ پہلی صورت میں آپ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں آپ کے لیے وسعت کا امکان تو ہے، مگر اسی طرح کی وسعت جیسی فاشست اٹلی اور نازی جرمنی حاصل کر رہا ہے، اور اس سے پہلے امپیریلسٹ برطانیہ حاصل کر چکا ہے۔ اس طرح کی وسعت حاصل کر کے آپ دنیا میں بس ایک اور مفسد قوم کا اضافہ کر دیں گے جو زمین میں کچھ مدت تک فساد پھیلائے گی اور بالآخر اپنے کیے کی

سزا پائے گی۔

بخلاف اس کے اگر آپ اسلامی مفہوم کے مطابق ایک ایسی اصولی جماعت ہوں جو محض ایک مسلک اور ایک جہانی نظریہ کے لیے جد وجہد کرتی ہو، اور جس میں ہر انسان آپ کے اصول قبول کر کے مساوی حقوق اور مساویانہ حیثیت کے ساتھ شریک ہو سکتا ہو، تو آپ ایک جامد پتھر کی طرح نہ ہوں گے بلکہ ایک نامی جسم کی طرح ہوں گے۔ آپ کی مثال اس درخت کی سی ہو گی جو ہر طرف اپنے گرد وپیش سے اجزا جذب کرتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں آپ ایک عالمگیر طاقت World Force ہوں گے۔ آپ دنیا کو اپنے لیے نہیں بلکہ اصولِ حق کے لیے فتح کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر واقعی آپ کے اصول فطرتِ انسانی کو اپیل کرنے والے اور انسانیت کی مشکلات کو حل کرنے والے ہیں — جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں — تو دنیا خود اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے آپ کے سامنے پیش کر دے گی۔ آپ کے شخصی یا قومی مفاد میں تو کوئی عالمگیر کشش نہیں ہے۔ اس کی طرف آپ دعوت دیں گے تو دنیا اس کی طرف خود کبھی نہ کھنچے گی بلکہ آپ کو زبردستی اسے کھینچنا پڑے گا۔ لیکن اسلام کے اصول میں عالمگیری کی طاقت ہے۔ دنیا ان کی طرف خود کھنچے گی بشرطیکہ آپ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے اصولوں کے لیے جئیں اور مریں۔ آپ کے سامنے اشتراکیت کی مثال موجود ہے۔ وہ ایک عالمگیر طاقت صرف اس لیے بنتی چلی گئی کہ اشتراکی لوگ اشتراکیوں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اشتراکیت کے اصول کے لیے جہاد کرتے رہے۔ آج اگر وہ اشتراکیت کے لیے جہاد کرنا چھوڑ دیں اور انھیں صرف اشتراکیوں کے مفاد کی فکر لگ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اشتراکیت کی عالمگیری ختم ہو جائے گی۔

اقلیت واکثریت

مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو ایک عالمگیر تحریک کے بجائے ایک جامد قومی کلچر، اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کے بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے لہذا اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت و اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اس کے لیئے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ سرشماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمان کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں سوجھتی کہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے۔ اس صورتِ حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ اس اللہ کے بندے کو نہ تو اُس طاقت کا علم ہے جو اس کے دین کی صورت میں اس کے پاس ہے، اور نہ اسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے۔ یہ اپنے دین کو ایک کُند ہتھیار اور اپنے آپ کو ایک "قوم" سمجھ رہا ہے اسی وجہ سے اس کو بچاؤ کی پڑ گئی ہے۔ اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہرگز اسے کوئی پریشانی پیش نہ آتی۔ اس کے لیئے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ "جماعتوں" کے لیے نہیں۔ جو

جماعتیں کسی طاقت ور نظریہ اور جان دار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اُٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گذر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانے کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمراں بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اُس طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے، اور محدود اغراض کے لیے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لیے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں۔

اسلام کے اصول اس غرض کے لیئے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اس پروگرام کو لے کر اگر مسلمان عملی مجاہدے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں حالات کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ ان کو اس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی قوتِ تسخیر چھپی ہوئی ہے۔ ان کے دماغوں کی پہنچ زیادہ سے زیادہ جہاں تک ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسرِ اقتدار ہیں ان میں سے کسی جماعت کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز نہیں ہے۔ غالباً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے، مگر جیسا کہ ابھی میں نے

بیان کیا اس کے ارکان بھی ۲۳ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ جس نظریہ ومسلک کے حامیوں کی تعداد صرف ایک ملک میں آٹھ کروڑ اور دنیا بھر میں چالیس کروڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرۂ زمین پر حکمران ہونا چاہیے۔ یہ نتیجہ یقیناً رونما ہوتا اگر ان لوگوں میں جماعتی احساس بیدار ہوتا، اور انھیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اس مشن کے لیے سعی وجہد پر کمربستہ ہوتے۔ لیکن جس چیز نے اس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر قطعی ناکارہ بنا دیا ہے وہ اسی احساس و شعور اور اسی آمادگیٔ عمل کا فقدان ہے۔ مختلف قسم کی شیطانی قوتیں اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ سے واقف نہ ہونے پائے، اور اس کو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آئے کہ یہ اپنی زندگی کے مشن کا خیال کر سکے۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کی جان کا لاگو بنا ہوا ہے، اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے ان مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کراتے ہیں بلکہ بسا اوقات سر پھٹول تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش ان کی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے وہاں کچھ دوسری قسم کے شیاطین نمودار ہوتے ہیں، اور وہ دنیوی ترقی وخوش حالی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد اور طریقِ کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ان لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے جس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بہت سے روگ جو اس قوم کو لگے ہوئے ہیں، انھوں نے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اس عظیم الشان تعداد کو

صفر کے درجہ تک نیچے گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لیئے جہاد اور محنت وجان فشانی چاہتا ہے، یہ اس سے بہت دور ہٹا دیے گئے ہیں۔ ان کے ذہن سے اسلام کا صحیح تصور اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بے گانہ کر دیے گئے ہیں۔ جو اسلام ان کے اندر پایا جاتا ہے اس کے لیے کوئی مستقبل نہیں، کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو امید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام از سرِ نو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اُٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں اپنے اصول کی حکمرانی و فرماں روائی قائم کرنے کے لیے نبرد آزما ہو، تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت ان مسلمانوں میں سے اس کو کچھ زیادہ والنٹیر نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ مل سکیں گے۔

اب جو لوگ حقیقت میں اُس اسلام کو جانتے اور سمجھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اور جن کا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح وسعادت اسی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل ومتوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے، ان کو چند غلط فہمیوں سے اپنے ذہن کو صاف کر لینا چاہیے اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں:

اوّل یہ کہ "مسلمانوں کے مفاد" سے اسلام کا دامن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال ہرگز کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اسلام اپنے پیرؤوں کے اس "مفاد" کو تسلیم کرتا ہے کہ ایک غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے کے لیے کتنے "مسلمانوں" کی خدمات فوج میں اور کتنوں کی پولیس میں اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں، اور کتنی نشستیں ان کو مجالس قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ خدا کے ملک میں وہ بھی غیر مسلموں کی طرح شریعت ساز بن کر بیٹھیں، اور کن ریاستوں کی مسند حکمرانی مسلمان فرمانرواؤں کے لیئے

محفوظ رکھی جائے تاکہ وہ غیر مسلم راجاؤں کی طرح مُلکِ خدا کے ناجائز مالک بنے بیٹھے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے۔ ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو ان مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے لکھے ہوئے ہیں، اور نہ اس کی کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرتِ تعداد ہی کوئی مضبوط رکاوٹ ہے۔ مردم شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے، اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب جتنا زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے، یہ صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اس کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک عملی پروگرام لے کر کوئی منظم جماعت اُٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیے کہ اس کا اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہے گا بلکہ شاید ان سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گا اور کوئی طاقت اس سیلِ رواں کو نہ روک سکے گی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس ہے کہ وہ اسلام کے ان امکانات سے ناواقف ہیں۔

تیسرے یہ کہ کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ اس کے حقیقی معتقدوں اور پیرؤوں کی تعداد ملک میں ۶۰ یا ۷۰ فی صدی ہو جائے۔ تاریخ کے واقعات اور خود موجودہ دنیا کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور منظم پارٹی جس کے ارکان اپنی تحریک پر پورا ایمان رکھتے ہوں، اور اس کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار رہوں، اور پارٹی ڈسپلن کی کامل اطاعت کرتے

ہوں، محض اپنے ایمان اور ڈسپلن کی طاقت سے برسر اقتدار آسکتی ہے خواہ اس کے ارکان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی ہزار بھی نہ ہو۔ پارٹی کا پروگرام کروڑوں کو اپیل کرتا ہے اور کروڑوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے، مگر خود پارٹی کے اندر صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف کمال درجے پر رکھتے ہوں۔ پس اسلام کو حکمراں بنانے کے لیے حقیقی مسلمانوں کی کسی بڑی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے ہی کافی ہیں بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔

شکایات

ناظرین "ترجمان القرآن" میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آپ کی نظر میں نہ موجودہ لیڈروں میں، نہ عوام میں کوئی اس قابل ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا کہلانے کا مستحق ہو، نہ موجودہ دور کی سیاسی کشمکش میں ان نام نہاد مسلمانوں کی بہبودی کی جدوجہد مستحسن ہے۔ پھر برائے خدا یہ بتائیے کہ یہ مسلمان کس نام سے پکارا جائے اور اس پر جو ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

یہ سچ ہے کہ دورِ حاضر کے مسلمان بورے ہیں۔ مذہب کی پابندی نہیں کرتے۔ لیکن آخر کیا انھیں ڈوبتا ہی چھوڑ دیا جائے؟ ..... کیا جس وقت تک سب راہ راست پر نہ آجائیں اس وقت تک نہ اپنے آپ کو کوئی مسلمان کہے نہ ان کی بہتری کے واسطے انھیں جیسے مسلمانوں کی طرف سے کوئی جدوجہد کی جائے؟ ..... ڈوبتے ہوئے سے یہ کہنا کہ تو گہرے پانی میں گیا ہی کیوں تھا اور تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے سراسر خلافِ انسانیت ہے۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ اسے نکالنے کی کوشش کی جائے اور ہر ممکن تدبیر اس کی جان بچانے کی عمل میں لائی جائے۔"

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:

"آپ کی روش میرے لیے اور مجھ جیسے خیالات رکھنے والے بہت سے لوگوں کے لئے سخت وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ جب تک آپ نیشنلسٹ مسلمانوں یا کانگریس سے تعاون کرنے والے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے رہے، ہم نے یہ سمجھا کہ آپ ہندوستان میں مسلمانوں

کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حامی ہیں اس لیے ان لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جن کے رویہ سے آپ کو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ہستی گم ہو جائے گی۔ مگر اب آپ نے اُن دو تحریکوں اور ان کے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اس انفرادیت کے تحفظ ہی کے لیے کوشاں ہیں، یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے تو بہرحال یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں، ایک منظم گروہ بنیں، کسی قیادت کے تحت حرکت کریں۔ اس مقصد کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس سے آپ کا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ مذہبیت کا احیاء چاہتے ہیں تو یہ بھی تب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظام بن جائے۔ فی الحال بُری یا بھلی، جیسی بھی ہے، جماعت تو بن رہی ہے۔ اس کا ساتھ دیجیے۔ پھر مذہبی احیاء کے لیے بھی کوشش کر لیجیے گا۔ لیکن آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا بھی ساتھ آپ دینا نہیں چاہتے"۔

یہ دو خط منجملہ اُن بہت سے شکایتی خطوط کے ہیں جو پچھلے دنوں مجھے وصول ہوئے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بہت بڑا گروہ اسی طرز پر سوچ رہا ہے اور ان خطوط میں دراصل اسی طرز خیال کی نمائندگی کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اوپر آپ تنقید کرنا اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آیند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس کام کو خوش آیند سمجھ کر نہیں کرتا۔ بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے جسے حلق سے اُتارتا ہوں، اور اچھی طرح اس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اس کے اندر پاتے ہوں گے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیے۔ تلخی تو واقع میں موجود ہے، تغافل کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک

سے معطل کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے نہ صرف غفلت برتنا بلکہ ان کے لیے جواز واستحسان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوشگوار چیز ہے جس سے دل خوب بہلتا ہے، مگر اس کی حقیقت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پینک ہے جس کے نشے میں مریض سو تو جاتا ہے، مگر وہ اندرونی خرابیاں دور نہیں ہوتیں جن کے سبب سے بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی انھیں اسی پینک کی خوراکیں دیا کروں۔ ان کی خواہش ہے کہ جس خیالی جنت میں وہ جی رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ آبِ حیواں پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں؛ اور جن غلط فہمیوں کا دلفریب طلسم انھوں نے اپنے گرد جما رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جن کے لیے ان چیزوں کا سر اہنا دین اور ملت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مسلمانوں کا مفاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مسلمانوں کی تنظیم، مسلمانوں کی جمعیت، مرکزیت، مسلمانوں کی ترقی و خوش حالی، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر بار بار زبانوں پر آتا ہے۔ میں بھی یہ ذکر کرتا ہوں، زید بھی کرتا ہے، بکر بھی کرتا ہے، .... اور ہر ایک شخص جو اس گروہ میں شامل ہے، انہی الفاظ سے اپنے مدعا کے اظہار میں کام لیتا ہے، مگر اس کے باوجود ہمارے عمل کی راہوں میں اختلاف ہے۔ ایک کسی طرف جا رہا ہے، دوسرا کسی اور طرف، تیسرا کسی اور طرف۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ محض اتفاقی امر ہے؟ یا اس کی تہ میں کوئی بنیادی سبب ہے جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان الفاظ مشترک ہیں مگر معنی و مفہوم میں اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ "مسلمان"، لیکن میں اس سے کچھ اور مراد لیتا ہوں، اور دوسرے اس کا مفہوم

کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر مفاد، فلاح و بہبود، تنظیم، جمعیت و مرکزیت، ترقی و خوش حالی اور ہر ایک چیز جو لفظ "مسلمان" کی نسبت سے بولی جاتی ہے ہمارے درمیان مختلف المعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی اُلجھن کے سبب سے غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں، اور جب لوگ اسے سلجھانے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو شکایات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تم کو مسلمانوں کے مفاد اور فلاح و بہبود اور ترقی و خوش حالی وغیرہ سے ہمدردی نہیں، جمعیت بن رہی ہے، مرکزیت پیدا ہو رہی ہے، مگر تم اس کی مخالفت کرتے ہو، مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام ہوتا ہے اور تم اس میں روڑے اٹکاتے ہو۔ حالانکہ ایک شخص ان الفاظ کا اطلاق جن مخصوص و متعین چیزوں پر کرتا ہے، دوسرے کے نزدیک ان پر یہ الفاظ منطبق ہی نہیں ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ کون کافر ہو گا جس کو فی نفسہٖ فلاحِ مسلمین وغیرہ سے دشمنی ہو۔

آئیے، ذرا تحقیق کر کے دیکھیں کہ اس الجھن کی نوعیت کیا ہے۔

مطلق اور مقید کا فرق ایک ایسی واضح چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں اطلاق اور عموم ہو تو اس کے استعمال میں وسعت ہوتی ہے۔ اور جب اسے مقید کر دیا جاتا ہے تو اس قید کا لحاظ کیے بغیر اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہم رنگ بولتے ہیں تو اس کا استعمال ہر رنگ پر ہو گا۔ کوئی چیز خواہ سیاہی میں ترقی کرے، یا سفیدی میں یا سرخی میں، بہر حال ہم کہیں گے کہ اس کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مگر جب رنگ کے ساتھ ہم سفید کی قید لگا دیں تو سیاہ، سرخ، سبز اور دوسری رنگ کی چیزوں پر ہم اس لفظ کا اطلاق نہ کر سکیں گے، اور سیاہی یا سرخی میں ترقی کرنے کو سفید رنگ کی ترقی کہنا صحیح نہ ہو گا۔ اسی طرح مثال کے طور پر لفظ "قافلہ" کو لیجیے۔ ہر قافلہ جو کسی طرف جا رہا ہو، اس لفظ سے موسوم ہو سکتا ہے۔ جس طرف بھی وہ بڑھے، اس کی پیش قدمی کو قافلہ کی پیش قدمی کہا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اس کا میر قافلہ بن سکتا ہے۔ ہر گاڑی پر وہ سفر کر سکتا ہے۔ ہر قسم کا زادِ سفر اس کا زادِ سفر ہو سکتا ہے۔ غرض وصل کے مطلق ہونے کی وجہ سے ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو مطلق ہی ہو گی۔ لیکن جب مثلاً عزمِ پشاور

کی قید سے مقید کر کے "قافلۂ پشاور" کہہ دیا جائے تو پھر وہ عموم باقی نہیں رہ سکتا جو محض قافلہ ہونے کی صورت میں تھا۔ "قافلۂ پشاور" کا اطلاق صرف اسی قافلہ پر ہوگا جو عازم پشاور ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جا تو رہا ہو مدراس یا بمبئی کی طرف اور کہلائے قافلۂ پشاور۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، پشاور کی قید سے مقید ہو جائے گی۔ مثلاً "قافلۂ پشاور کی پیش قدمی کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پشاور کی سڑک پر چل رہا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری سڑک پر بڑھ رہا ہو تو اسے قافلۂ پشاور کی پیش قدمی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اسے پیش قدمی کے بجائے رجعت کہا جائے گا۔ کیونکہ دوسرے راستہ پر وہ جتنے قدم بھی چلے گا پشاور کی نسبت سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اس کا میر قافلہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو پشاور کا راستہ جانتا ہو۔ دوسرے راستوں کے علم میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو، اگر وہ پشاور کی راہ سے ناواقف ہے تو بہر حال وہ قافلۂ پشاور کا سردار نہیں بن سکتا۔ اسی پر دوسرے تمام امور کو بھی قیاس کر لیجیے۔

اب دیکھیے کہ اُلجھن کس طرح پیش آتی ہے۔ قافلہ ہی کی مثال کو لے لیجیے۔ ایک قافلہ کا نام تو ہے "قافلۂ پشاور"۔ مگر آپ یا تو پشاور کی قید کو بھول کر اسے محض قافلہ سمجھ لیتے ہیں۔ یا آپ کو پشاور کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ یا آپ کا خیال یہ ہے کہ اس قافلہ کے لوگ جب ایک دفعہ "قافلۂ پشاور" کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں تو اب یہ پشاور کے سوا جس رُخ پر چاہیں سفر کریں بہر حال انھیں کہنا چاہیے قافلۂ پشاور ہی۔ بخلاف اس کے میں قافلۂ پشاور کو اس کے اصلی معنی میں لیتا ہوں اور پشاور کی قید کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قافلہ کے بارے میں جتنی گفتگو ہوتی ہے، میرے اور آپ کے درمیان بات بات پر تصادم واقع ہوتا ہے۔ جب تک بات مجمل رہتی ہے ہم متفق رہتے ہیں: قافلہ کے منتشر مسافروں کو جمع کیا جائے، انھیں دوسرے قافلوں میں گم نہ ہونے دیا جائے، رہزنوں سے ان کی حفاظت کی جائے، ان کے لیے زادِ راہ درکار ہے، انھیں ایک میر قافلہ کی ضرورت ہے، ان کو منظم طور پر تیز رفتاری سے منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے، یہ سب باتیں مبہم اور مجمل الفاظ میں جب

تک کہی جاتی ہیں، میں اور آپ دونوں ان سے اتفاق کرتے ہیں. مگر جب انہی چیزوں کے تعین کا وقت آتا ہے تو آپ کے اور میرے خیالات میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور اس قافلے کے لوگوں کو جمع کر کے بمبئی کی طرف چلانا شروع کر دیتا ہے، دوسرا آتا ہے اور کلکتہ کی طرف چل پڑتا ہے، تیسرا آتا ہے اور کسی اور طرف کا رُخ کرتا ہے۔ آپ ہر میر قافلہ کے جھنڈے کو دیکھ کر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور پکارتے ہیں کہ چل پڑا "پشاور ی قافلہ"۔ میں اسی پر اعتراض کرتا ہوں کہ یہ جمعیت اور یہ پیش قدمی قافلۂ پشاور کی جمعیت اور پیش قدمی نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں منتشر مسافر جمع تو ہو رہے ہیں اور صورت قافلیہ تو بن رہی ہے. میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بجا و درست مگر محض جمع ہونے اور صورتِ قافلیہ بن جانے کا نام تو قافلۂ پشاور بننا نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ دیکھو، کتنی اچھی، تیز رفتار، شاندار گاڑی ہے جس پر یہ قافلہ جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی بیان کردہ صفات سے انکار نہیں، مگر یہ گاڑی جا کدھر رہی ہے؟ اگر اس کا رُخ پشاور کی طرف نہیں ہے تو قافلۂ پشاور کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں تو اس کی تیز رفتاری اور زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ روز بروز قافلہ کو اس کی منزل مقصود سے دور تر لے جاتی رہے گی۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب قافلہ بننے اور گاڑی چلنے تو دو پھر پشاور کی سڑک بھی لے ہی لیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک عزم پشاور ملتوی ہے اور دوسرے راستوں پر آپ گامزن ہیں، اس وقت تک کے لیے نام تبدیل فرمائیے۔ مجھے آپ کی گاڑی چلنے پر اعتراض نہیں بلکہ اس پر ہے کہ آپ چلیں تو بمبئی یا مدراس یا کلکتہ کی طرف اور نام آپ کا قافلۂ پشاور ہی رہے۔ آپ کہتے ہیں کہ حضرت پشاور کی سڑک تو بڑی دشوار گذار ہے، اس وقت اُدھر جانا تو محال ہے، لہٰذا سر دست تو قافلۂ پشاور کو دوسرے آسان راستوں ہی پر چلنے دو۔ میں گذارش کرتا ہوں کہ میں نے آپ کو دشوار گذار راستے کی طرف گھسیٹنے پر اصرار کب کیا تھا؟ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ قافلۂ پشاور کا پشاور کے سوا دوسری سمت میں چلنا اور پھر قافلۂ پشاور ہی رہنا متناقض بات ہے۔ آپ اس تناقض کو دور فرما دیں۔

اس تمام بحث میں بنائے نزاع صرف یہ ہے کہ آپ مقید کو مطلق بناتے ہیں اور اس کے تمام متعلقات کو قید سے آزاد کیے دیتے ہیں۔ اور میں مقید کو مقید ہی سمجھ کر بات کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو صاف کرلیں اور یہ بات سمجھ لیں کہ مطلق قافلہ، اور قافلۂ پشاور میں کیا فرق ہے تو کوئی الجھن پیش نہیں آسکتی۔ لیکن آپ سیدھی سمجھ کی بات اختیار کرنے کے بجائے گفتگو کا رُخ کچھ دوسری ہی باتوں کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ تم قافلہ کے اجتماع اور اس کی تنظیم اور اس کی پیش قدمی کے مخالف ہو۔ حالانکہ نفسِ اجتماع و تنظیم اور نفس پیش قدمی سے کس کافر نے انکار کیا تھا۔ کبھی آپ سوال کرتے ہیں کہ یہ قافلہ اگر قافلۂ پشاور نہیں تو اور کس نام سے یاد کیا جائے؟ حالانکہ اس کا نام تجویز کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میری بات تو صاف ہے۔ اگر یہ پشاور کی سڑک پر ہے تو قافلۂ پشاور ہے۔ اگر اس پر نہیں ہے تو اپنے لیے جو نام چاہے تجویز کرلے بہرحال اس پر قافلۂ پشاور کا نام راست نہیں آتا۔ آپ چاہیں تو اس امر پر بحث کر لیجیے کہ جس سڑک پر یہ جا رہا ہے، وہ پشاور کی سڑک ہے یا نہیں۔ مگر یہ اصول آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو اس سڑک پر نہ ہو وہ قافلۂ پشاور نہیں ہے۔ پھر آپ ہمدردی کا سوال چھیڑ دیتے ہیں حالانکہ ہمدردی اور بے دردی کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو واقعہ اور حقیقت کا سوال ہے۔ مدراس یا کلکتہ کی طرف جانے والوں کو آخر میں عازم پشاور کس طرح کہوں؟ جانتے بوجھتے ایک خلافِ واقعہ بات باور کرانا آخر ہمدردی کی کونسی قسم ہے؟ میرے نزدیک تو ہمدردی کی صورت یہی ہے کہ صاف صاف لوگوں کو بتا دیا جائے کہ یہ پشاور کی سڑک ہے اور یہ دوسری سڑکیں فلاں فلاں سمت کو جاتی ہیں۔ جو لوگ فی الواقع پشاور جانا چاہتے ہیں مگر راستہ سے ناواقف ہونے کے باعث دوسرے راستوں پر بھٹک رہے ہیں یا بھٹکائے جا رہے ہیں وہ صحیح راستہ معلوم کرلیں گے۔ اور جو حقیقت میں جانا ہی دوسری طرف چاہتے ہیں میں نہ تو ان کا راستہ روکنا چاہتا ہوں، نہ اُن سے مجھے کوئی دشمنی ہے کہ انسانیت کے خلاف ان کے ساتھ کوئی بے دردی کروں۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جدھر جانا چاہتے ہیں سمجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ جائیں، اور جب جائیں تو

ناطانام کے ساتھ سفر نہ کریں۔

مسلمانوں کے معاملہ میں جو الجھن پیش آرہی ہے اس کی نوعیت بعینہٖ وہی ہے جو اوپر کی مثال میں بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کا لفظ اسلام سے ماخوذ ہے اور اسلام ایک طریقِ فکر، ایک مقصدِ زندگی، ایک کیرکٹر اور ایک طرزِ عمل کا نام ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان کے معنی محض آدمی کے نہیں ہیں بلکہ اُس آدمی کے ہیں جو زندگی کے تمام معاملات میں وہ خاص طریقِ فکر، وہ خاص مقصد اور وہ خاص طرزِ عمل رکھتا ہو جس کا نام اسلام ہے۔ لفظ "مسلمان" کے ان تقییدات کو اگر صاف صاف سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی فلاح وبہبود، اُن کا مفاد، ان کی تنظیم، اُن کی قیادت وامارت، غرض اُن سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا مفہوم معین ہو جائے گا۔ لیکن اگر ان تقیدات سے قطع نظر کر کے "مسلمان" کے لفظ کو مطلقاً ایک گروہ اشخاص کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ جس چیز کو چاہے مسلمانوں کا مفاد کہدے، جس چیز کو چاہے ان کی فلاح وبہبود قرار دے لے، جس نوع کی تنظیم کو چاہے ان کی تنظیم سمجھ لے، اور جو شخص بھی انسانی گلّے کو ہانکنے کی قابلیت رکھنے والا دکھائی دے اُسے مسلمانوں کا قائدِ ملت اور امیرِ مطاع ماننے پر آمادہ ہو جائے۔

بدقسمتی سے یہاں کچھ ایسی ہی صورتِ حال درپیش ہے۔ "اسلام" کی قید سے قطع نظر کر کے فی الواقع مسلمانوں کو محض ایک گروہ اشخاص سمجھ لیا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عجیب عجیب چیزوں پر مسلمانوں کے مفاد، ان کی فلاح وبہبود، ان کی تنظیم وجمعیت، ان کی قیادت وامارت وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہنے والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ یہ بینک اور انشورنس اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے استفادہ کریں۔ حالانکہ مسلمان کا لفظ اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس کی رو سے مسلمان مامور ہیں اس پر کہ اُس پورے نظامِ مالیات کو توڑ ڈالیں جو اس وقت دنیا میں قائم ہے اور اپنے اصول پر ایک نیا نظام بنائیں۔ پھر یہ الجھے ہوئے دماغ کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے جس نظام کے ساتھ آپ کی اصولی عداوت ہے اسی میں آپ اپنا مفاد سمجھیں اور پھر اس کا نام "مسلمانوں کا مفاد" رکھیں؟ اسی طرح سرکاری ملازمتوں

اور شریعت ساز مجالس کی نشستوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو "مسلمان کے مفاد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمان کے لفظ کو اگر اسلام کی قید سے مقیّد کرکے لیا جائے تو یہ سب چیزیں مسلمان کے مفاد کی ضد ہیں۔ مسلمان کے مفاد کی حیثیت سے تو آپ کا کام اس نظام حکمرانی کو بدل ڈالنا ہے جسے چلانے کو آپ اپنا مفاد کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ نظام تعلیم جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے اس کے تحت اپنی نسلوں کا ذہن تیار کرنا آپ کے نزدیک مسلمان کی فلاح وبہبود اور ترقی کا ذریعہ ہے، اور اس نظام کے تحت آپ خود اپنے خرچ سے درسگاہیں بنا کر ان کے نام اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی رکھتے ہیں، حالانکہ یہ پورا نظام تعلیم انسانیت کی تشکیل ایسے نقشہ پر کرتا ہے جو اسلامی نقشہ کے عین برعکس ہے۔

ایسا ہی غلط تصور آپ کے ذہن میں مسلمانوں کی جمعیت، مسلمانوں کی تنظیم اور مسلمانوں کی قیادت کا بھی ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ اسلام کس تحریک کا نام ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اصول کیا ہیں، اور وہ کیا طرزِ عمل چاہتا ہے، تو آپ بڑی آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُن سیاسی جمعیتوں اور تنظیموں اور اُن قائدوں اور امیروں کی صحیح حیثیت کیا ہے جو اسلام کے نام سے اس وقت کام کر رہے ہیں۔ اسلام کی رو سے مسلمانوں کی جمعیت صرف وہ ہو سکتی ہے جو غیر الٰہی حکومت کو مٹا کر الٰہی حکومت قائم کرنے اور قانون خداوندی کو حکمراں کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ جو جماعت ایسا نہیں کرتی بلکہ غیر الٰہی نظام کے اندر "مسلمان" نامی ایک قوم کے دنیوی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہے وہ نہ تو اسلامی جماعت ہے اور نہ اسے مسلمانوں کی جماعت ہی کہنا درست ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی تنظیم صرف وہی ہو سکتی ہے جو خالص اسلامی اصولِ اجتماع پر قائم ہو اور جس کا مقصد اسلامی ہو۔ ورنہ جو تنظیم فاشستی اصولوں پر کی جائے اور جس کا مقصد محض اپنی قوم کا غلبہ وتمکن ہو اسے محض اس بنا پر مسلمانوں کی تنظیم نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مردم شماری کے مسلمانوں کو منظم کرتی ہے اور ان کے "استخلاف فی الارض" کے لیے کوشاں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مسلمانوں کے رہنما بھی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو سب سے پہلے اسلامی تحریک کے مقصد، اصول اور طریق کار کو جانتے ہوں اور اہل تقویٰ ودیانت

ہوں۔ باقی رہے وہ لوگ جو سرے سے اسلام کا علم ہی نہ رکھتے ہوں یا ناقص علم کی بنا پر اسلام اور جاہلیت کو خلط ملط کرتے ہوں اور پھر تقویٰ و دیانت کی کم سے کم ضروری شرائط سے بھی عاری ہوں، تو ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرز تنظیم کے استاد فن ہیں، اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔

یہ باتیں جب مسلمانوں سے صاف صاف کہی جاتی ہیں تو وہ اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور شکایات کے طومار باندھ دیتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس معاملہ میں جذبات کی برانگیختگی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اسلام کے لیے اسلام کے اصول پر کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنے لیے اپنے اصول پر۔ اگر پہلی بات ہے تو انھیں سیدھی طرح ہر اس چیز کو ترک کرنا چاہیے جو غیر اسلامی ہے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں شوق سے کریں، ہم ان کا راستہ روکنے نہیں آتے، ہمارا مطالبہ ان سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقہ پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔

راہ رَ وِ پشت بہ منزل

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی کام کرتے ہیں۔ ایک وہ جو حالات کو، جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں، جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں۔ اور ان کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ انھیں کیا ہونا چاہیے، اور اس نقطۂ نگاہ سے وہ حاضر الوقت نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلا گروہ حال کی گاڑی کو چلاتا ہے، اور دوسرا مستقبل کی اصلاح و ترقی کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں تعاون ضروری ہے، مگر ان کے تعاون کی فطری صورت یہی ہے کہ ان میں تصادم ہو۔

"کیا ہے" پر نظر رکھنے والے ہمیشہ حال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، خوب ہو رہا ہے، اس میں کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو یہ وقت تنقید کا نہیں ہے، کیونکہ اس وقت تنقید کی جائے گی تو یہ یہ خرابیاں پیدا ہوں گی، اور فلاں فلاں مصلحتوں کو ٹھیس لگے گی۔ یہ سب باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی نگاہ وقتی مصالح اور فوری فوائد میں اُلجھی رہتی ہے۔ عاجلہ کی محبت انھیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ آجلہ کی فکر کریں۔ اُن کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کوئی وقت بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہو گا خوب ہی ہو رہا ہو گا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ وقتی مصلحتیں ٹھیس کھانے کے لیے موجود ہوں گی، ہر وقت ان مصلحتوں کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہیں گے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے، اور سچ یہ ہے کہ وہ خود کبھی نہ بتا سکیں گے کہ کونسا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جن کی نظر "کیا ہونا چاہیے" پر ہوتی ہے وہ چونکہ حالات کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے وہ اسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو "اہل حال" کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے۔ انھیں

اپنا کام پرستارانِ عاجلہ کی چیخوں اور فریادوں، بلکہ گالیوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے" کی ذہنیت عام لوگوں پر مستولی ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی۔ خامیوں کا احساس یا تو پیدا ہی نہیں ہوگا کہ انھیں دور کرنے کی طرف توجہ ہو، یا اگر تھوڑا سا احساس ابھرا بھی تو حال کے شیدائی اسے دبانے کے لیے بیسیوں قسم کی تاویلیں کریں گے، تاکہ ان کی خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

"کیا ہونا چاہیے" کے نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ حال میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یکلخت بند ہو جائے، اور اُس وقت تک جمود و تعطل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (IDEAL) حالت رونما نہ ہو جائے جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ نظری طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ بتدریج ہوا کرتا ہے۔ اول اول تو اسے سخت تلخی اور ناگواری کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طبیعتیں نقد سے مانوس اور نسیہ سے نفور ہوتی ہیں۔ پھر ایک دور شبہات کا گذرتا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سوا ہر ممکن چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر فی الواقع تنقید میں کوئی جان ہوتی ہے اور درحقیقت حاضر الوقت نظام میں وہ خامیاں پائی جاتی ہیں جن کی نشان دہی تنقید میں کی گئی ہے، اور عام لوگوں کی روح بھی حقیقت میں اسی معیار کو حق تسلیم کرتی ہے جسے مدنظر رکھ کر ناقد نے تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح کی ضرورت محسوس کرنی شروع کرتے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں رائے عام تیار ہوتی جاتی ہے، وقت کی قیادت پر دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ یا تو پچھلے قائدوں کو اپنی حالت اور اپنی پالیسی بدلنی پڑتی ہے، یا پھر تغیر پذیر حالات کے اقتضاء سے ایک نئی قیادت (Leadership) خود بخود نشوونما پا کر سامنے آجاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کبھی تاریخ کی رفتار میں خلا یا شگاف پیدا نہیں ہوتا کہ تعطل کی وہ حالت پیش آئے جس کی بھیانک تصویر کھینچ کھینچ کر اہل حال "حضرات صلاح

وترقی کی ہر کوشش کو سم قاتل ثابت کیا کرتے ہیں۔

کسی حالت کو مثال یا آئیڈیل قرار دے کر اس کے لحاظ سے حال پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعتہً چھلانگ لگا کر اس مثالی حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے طفرہ کا تصور بھی نہیں کرسکتا، کیونکہ تغیر بہرحال تدریجاً ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحب عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ جس حالت کو مثال قرار دیتا ہو اس کے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی راضی ہوجائے۔ وہ اگر ذوی العقول میں سے ہے تو اس میں کم از کم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے خلافت راشدہ کے طرز کی قیادت سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو وہ فاروق اعظم سے کم نہ ہو اور اس کے ساتھی سب کے سب علی مرتضیٰ اور ابوعبیدہ بن الجراح اور عبدالرحمٰن ابن عوف کے مثیل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزل مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابۂ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اس کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ اس کے عین مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطح زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہرحال میں وہی ذریعہ تلاش کروں گا جو مجھے اوپر کی طرف لے جاسکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اٹھائے۔ ایسا ذریعہ مجھے نہ ملے گا تو میں سطح زمین ہی پر قیام کرنا پسند کروں گا۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میں اوپر جانے کے ارادے سے ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کوئلے کی کان میں اُترنا شروع کر دیتا ہوں اور اس راستے سے اُس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپ کو میرے فاتر العقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟ بالکل اسی طرح آپ کو میرے فتورِ عقل میں اس وقت بھی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے

اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ان لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جن کی عملی زندگی میں اور جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست، اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی، جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انھیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اُسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں[1]، جن کو نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین ودساتیر ہی میں ملتا ہے، اُسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اس کے بعد اگر کوئی چیز ان کی نگاہ میں قابلِ لحاظ ہوتی ہے تو محض وقتی سیاست کی مصلحتیں جنھیں وہ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں؟

منزل مقصود وہ اور راستہ یہ! کون عقلمند یہ مان لے گا کہ اُس چیز کو مقصود قرار دینے والا انسان اس راستہ پر قدم رکھنے کا خیال بھی کر سکتا ہے؟

پشت بمنزل چلنے والا تو خیر ناداں بن کر چھوٹ سکتا ہے، مگر اس شخص کا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے جو اپنے ہی آئیڈیل سے ــــ جس کو وہ خود آئیڈیل کہتا ہو ــ گھبرائے، اس کا نام سن کر چیں بجبیں ہو جائے، اس کو پامال ہوتے دیکھ کر آفریں ومرحبا کے نعرے بلند کرے، اس کی حمایت کرنے والے کا منہ نوچنے کے لیے دوڑے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جائے کہ آئیڈیل تو میرا وہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی قسم دریافت ہوئی ہے جس سے ہم ابھی تک آشنا نہ تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سن کر دلوں میں حرارت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ

---

[1] اس عجائب کی دنیا میں جو عجیب باتیں سننے میں آتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ہمارے لیڈر اگرچہ قرآن سے ناواقف ہیں مگر پھر بھی جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ عین قرآن کے مطابق ہے"۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت ایک فضول چیز ہے، علمِ قرآن کے بغیر بھی انسان اس صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ حمیتِ جاہلیہ کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے!

اور غمگین ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری سے اس کے خلاف چلتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں اس غلط روی پر اسے ٹوک دیا جائے تو اس کی نگاہ شرم کے مارے اٹھ نہیں سکتی۔ مگر اب ہمارا تعارف اس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوا ہے جو ہے تو آئیڈیل ہی، لیکن اس کا نام لے دیجیے تو چہرے بگڑنے لگتے ہیں۔ اس کی طرف چلنے کے لیے کہیے تو شدتِ غضب سے تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اس کے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال دیدہ دلیری وجسارت کے ساتھ تاویلیں کی جاتی ہیں، اس کی حمایت کرنے والے سے بڑھ کر نگاہ میں کوئی مبغوض نہیں ہوتا، اور اسے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں ہوتا — کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اس کے پرستار!

طرفہ تماشا یہ ہے کہ کانگریس اور اس کے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی کلچر کا نام لیا جاتا ہے، اور انہی ناموں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دی جاتی ہے۔ مگر جہاں یہ اسلام اور اس کی کلچر کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانین علانیہ توڑے جاتے ہیں، اسی کلچر کو ذبح کیا جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اس لیے ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اسلامی کلچر کا جھٹکا نہ ہونے پائے بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کو حلال کریں۔

وہاں "مسلمان" عورت اُسی طرح تبرّج جاہلیت کے ساتھ شمع انجمن بنی نظر آتی ہے جس طرح کوئی شریمتی جی یا کوئی میم صاحبہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت جلسے ہوتے رہتے ہیں اور اگر بادلِ ناخواستہ ملتوی کیے بھی جاتے ہیں تو پیشواؤں سے لے کر پیروؤں تک شاذونادر ہی کوئی نماز کے لیے اٹھتا ہے۔ وہاں لباسوں میں، نشست وبرخاست میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلامی کلچر کا کہیں نام ونشان تک نظر نہیں آتا، اور ایک معمولی مسلمان ان حامیانِ اسلام اور محافظینِ تہذیبِ اسلامی کی صحبت میں پہنچ کر اپنے آپ کو اتنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں کی کسی محفل میں کر سکتا ہے۔ وہاں کے مباحث آپ گھنٹوں سنتے رہیں مگر بھولے سے بھی کہیں قرآن وحدیث کا ذکر نہ آئے گا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے اللہ اور

اس کے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا، بلکہ قرآن وسنت کا نقطۂ نظر صریح طور پر ان کے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بلا تکلف اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا۔ ان کی کمیٹیوں اور ان کے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر کبھی اس حیثیت سے نہ سنیں گے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب بھی رکھتا ہے، اور کوئی الٰہی مشن بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے بجائے وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوگی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعۂ افراد پایا جاتا ہے اس کو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ قبلہ کدھر ہے، اور اسبابِ عیش وعشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہوسکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شاید کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے، الا ماشاء اللہ۔

کیا وہ کلچر جسے کانگریس اور اس کی تحریک وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، یہی ہے؟ اور یہی اس کے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے، ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اُس حکومتِ الٰہیہ تک پہنچا جائے گا جسے منتہائے نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ —— یہ سوال اتنا خطرناک ہے کہ اسے زبان پر لانا اپنی شامت کو خود دعوت دینا ہے۔ آپ کی زبان سے اسلام اور اس کی کلچر کا ذکر سنتے ہی ہر طرف سے شور برپا ہوگا کہ یہ کیا صدائے بے ہنگام بلند کرنی شروع کر دی؟ آخر اس ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں کہ ابھی ہم کلچر کی حفاظت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بھلا جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں کلچر کا تحفظ کیا جاتا ہوگا؟

یہی دو رنگی اور گندم نمائی وجو فروشی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اصل سوال محض معاشی وسیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض عام مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے بہانہ

بنا دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ آپ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں واقعی آپ مخلص ہیں۔ زبان سے کہیے کہ دل میں درد ہے، مگر ہاتھ سے بار بار پیٹ ہی کو بھینچے جائیے تو دیکھنے والا یہی خیال کرے گا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اس کا رعب اٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ و انتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر افسوس کہ عقل و خرد کی کمی نے اس مفید احساس کو بھی غلط راستہ پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ اجتماع اور تنظیم اور مرکزیت بجائے خود رحمت ہیں لہذا جو مرکز سامنے آئے اس کے گرد جمع ہو جاؤ اور سب مل کر چلو، انشاء اللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔ گویا جس طرح کبھی یہ خبط پیدا ہوا تھا کہ "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" اور "ادب محض ادب کے لیے" اسی طرح اب یہ ایک نیا خبط پیدا ہو رہا ہے کہ "اجتماع بس اجتماع کی خاطر" اور "تنظیم محض بغرض تنظیم" اور "مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے"۔ حالانکہ ان چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی نوعیت پر ہے۔ کسی غلط مرکز کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا بجائے مفید ہونے کے اُلٹا مضر ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آخر ان کا مطمح نظر کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی معنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلام اور اس کی تہذیب کا تحفظ کر سکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو، تو آپ کو جان لینا چاہیے کہ جو صورتِ تنظیم اس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اِس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی برعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبے کو انجن کی جگہ لگا دینا جس چڑھائی پر آپ

جانا چاہتے ہیں۔ یہ نام نہاد انجن آپ کی گاڑی کو اس طرف ایک انچ بھی لے کر نہیں جا سکتا، البتہ گاڑی اپنے وزن سے آپ نشیب کی طرف لڑھکے گی اور آپ لوگ کچھ مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ ماشاء اللہ "ہمارا انجن" اسے خوب اڑائے لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو جتنی جلدی سمجھ لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گذر رہا ہے وہ آپ کو اوپر کے بجائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپ کی تہذیب کو جانتے ہی نہیں وہ اس کا تحفظ کیا کریں گے؟ جو اس سے علانیہ برسر بغاوت ہیں کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور ارتقاء ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے کلچر کلچر ضرور پکارتے ہیں، لیکن اگر حقیقت میں کلچر ہی کا درد اُن کے دل میں اُٹھا ہوتا تو یقیناً ان کی زندگیاں بدل گئی ہوتیں، ان کی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں، اور ان کا طرز فکر بدل گیا ہوتا۔ یہ علامت ان کی زندگیوں میں ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ میں حقیقی اسلامی جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی نصب العین آپ کے سامنے نہیں ہے بلکہ محض سادہ معنی میں ایک قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اپنے اندر نیشنلزم کی روح پیدا کر کے دوسری قوموں کے ساتھ کامیاب مسابقت کرنا آپ کا آخری مطمح نظر ہے، تو بلاشبہ آپ کو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور مجھے آپ سے کسی بحث کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ کا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جدا۔ البتہ وہی بات پھر کہوں گا جو اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی اس قوم پرستانہ تحریک کے لیے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اسلام ہر قسم کی قوم پرستی کا دشمن ہے خواہ وہ ہندوستانی قوم پرستی ہو یا نام نہاد "مسلم قوم پرستی"۔

بعض حضرات اس قسم کے غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن و حدیث سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ گویا یہی "وہ جماعت" ہے جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اور جس سے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اسے ناواقفیت کا کرشمہ سمجھا جائے یا خدا اور رسول کے مقابلہ میں

جسارت۔ قرآن تو اُس مسجد تک میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس کی بنیا دتقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا نام لینے والے خبطی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کی رسی" کو سب مل کر مضبوط تھامو۔ اور یہاں کہا جارہا ہے کہ بس سب لوگوں کا متفق ہو کر کسی رسی کو تھام لینا ہی ذریعۂ نجات ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کی رسی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ:

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ۔ (المائدہ - ۸)	مسلمانو! تمھارے حقیقی دوست اور ساتھی صرف اللہ اور رسول اللہ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور خدا کے آگے جھکنے والے ہیں۔

بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ (التوبہ - ۲)	پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔

مگر یہاں نماز اور زکوٰۃ کی شرط کو محض بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ برادری اور ولایت تو درکنار، امامت اور سرداری تک کے لیے یہ چیزیں شرط نہیں ہیں۔ بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی ان شرطوں کا نام لے لیجیے تو تیوریوں میں بل پڑ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث میں التزامِ جماعت اور اطاعتِ امام کے متعلق جو احکام ہیں، اور مَن شذّ شذّ فی النار اور اسی قسم کی جو وعیدیں جماعت اور امام سے الگ ہونے والوں کو سنائی گئی ہیں، انھیں کوئی واسطہ ان جماعتوں اور اماموں سے نہیں ہے جو محض قوم پرستی کے اصولوں پر دنیوی اغراض کے لیے بنی ہوں۔ وہاں تو التزامِ جماعت سے مراد دراصل اس جماعت کا التزام ہے جو دنیوی اغراض سے پاک ہو کر خالصۃً لوجہ اللہ اسلام کے مشن کی خدمت کے لیے بنی ہو۔ ایسی جماعت سے الگ ہونے کا نتیجہ یقیناً نارِ جہنم ہے اور ہونا چاہیے۔ مگر ان ہدایات کو دنیوی جتھہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کی وفاداری کے لیے دلیل بنانا خدا کے رسول پر

بہتان گھڑنا ہے۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں اگر معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدوجہد کرنی ہو تو وہ عام قوانین طبعی کے مطابق اپنا جتھا بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ اسے خدا کو بیچ میں لانے کا کیا حق ہے؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانبدار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ ایک کی جتھہ بندی سے الگ ہونے والوں کو تو وہ جہنم کی سزا نہ دے اور دوسری کے جتھے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہر اس شخص کے سامنے جہنم پیش کردے جو اس سے الگ ہو یا الگ رہے؟

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ دو، لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر زیادہ دیر تک جمی نہیں رہ سکتی۔ اسی بنا پر حضور نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی۔ مگر جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہوں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو ان کے بڑے گلے کا نام ہرگز "سوادِ اعظم" نہیں ہے۔ نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے "جماعت" ہے۔ نہ ان کی امارت اسلامی اصطلاح کی رو سے "امارت" ہے۔ نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔

اِسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین

جب کسی شخص پر بار بار تشنج، ہذیان اور بحران کے دورے پڑتے ہوں اور درمیانی وقفوں میں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف سے بے تاب رہتا ہو تو اس کی حالت کو دیکھ کر عقلمند لوگ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ وہ اسے محض اوپری خلل کا اثر قرار دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خود اس کے اپنے نظامِ جسمانی کے اندر کوئی خرابی موجود ہے؟ وہ تشنج کا علاج ہاتھ پاؤں باندھنے سے ہذیان کا علاج منہ بند کرنے سے اور بخار کا علاج برف میں دبانے سے کرتے ہیں یا ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس اصل خرابی کو سمجھیں جو کارگاہِ بدن کی ترکیب میں پیدا ہو گئی ہے اور ساری تدبیریں اسی کو دور کرنے میں صرف کر دیں؟

جہاں تک انفرادی حالات کا تعلق ہے، ہر صاحبِ عقل ایسے مواقع پر دوسری صورت ہی اختیار کیا کرتا ہے۔ مگر تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جو عقل ایک فرد کو اس حالت میں دیکھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ کہاں ماری جاتی ہے جب پوری انسانیت اس کے سامنے اسی حال میں ہو۔ تمام عالمِ انسانی اس وقت ایک شدید بحران میں مبتلا ہے۔ اس پر تشنج کا ایک ایسا زبردست دورہ پڑا ہے جس سے ساری زمین دہل گئی ہے۔ اور یہ کوئی پہلا دورہ نہیں ہے۔ ایک مدت سے پیہم اُس پر ایسے ہی دورے پڑ رہے ہیں۔ اور دوروں کے درمیان جو وقفہ گذرتا ہے اس میں بھی کبھی وہ چین سے نہیں رہتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی درد سے بے چین ہی رہتا ہے۔ مگر باوجودیکہ مدتہائے دراز سے یہ صورتِ حال ساری دنیا میں مشاہدہ کی جا رہی ہے، کسی کا ذہن اِدھر نہیں جاتا کہ انسانی تمدن و عمران کی اساس میں ایک بنیادی خرابی موجود ہے۔ ساری دنیا کے بُوجھ بُجھکڑ اپنی اپنی نظریں صرف ان خارجی علامات ہی پر جمائے ہوئے ہیں جو اندرونی خرابی کی وجہ سے سطح پر نمایاں ہوتی ہیں،

اور ہر ایک کو سطح پر جو پھوڑا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اسی پر انگلی رکھ کر کہہ دیتا ہے کہ بس اس کا آپریشن کر دو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ بس کی گانٹھ ڈکٹیٹر شپ ہے، اس کو کاٹ دو۔ کوئی کہتا ہے کہ ساری خرابی امپیریلزم کی وجہ سے ہے اسے مٹا دو۔ کوئی کہتا ہے کہ سرمایہ دار نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، اس کا خاتمہ کر دو۔ اِن نادانوں کی عقل کہاں گُم ہو گئی ہے؟ یہ شاخوں کو جڑ سمجھ رہے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جڑ کہیں اور ہے، اور وہ جب تک زمین پکڑے رہے گی، شاخیں برابر نکلتی ہی رہیں گی خواہ قیامت تک ان کو کاٹنے میں وقت ضائع کیا جاتا رہے۔

دنیا میں جہاں جو خرابی بھی پائی جاتی ہے اس کی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا۔ یہی ام الخبائث ہے۔ یہی اصل بس کی گانٹھ ہے۔ اسی سے وہ شجر خبیث پیدا ہوتا ہے جس کی شاخیں پھیل پھیل کر انسان پر مصیبتوں کے زہریلے پھل ٹپکاتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع و بُرید کر لیں، بجز اس کے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا کہ ایک طرف سے مصائب کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے۔

ڈکٹیٹر شپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائے گا تو حاصل کیا ہو گا؟ یہی نا کہ ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائے گا اور اس کی جگہ پارلیمنٹ خدا بن جائے گی۔ مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا ظلم اور بغی اور فساد فی الارض سے وہ جگہ خالی ہے جہاں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟

امپیریلزم کا خاتمہ کیا جائے گا تو اس کا حاصل کیا ہو گا؟ بس یہی کہ ایک قوم پر سے دوسری قوم کی خدائی اُتر جائے گی۔ مگر کیا واقعی اس کے بعد زمین پر امن اور خوش حالی کا دور شروع ہو جاتا ہے؟ کیا وہاں انسان کو چین نصیب ہے جہاں قوم آپ اپنی خدا بنی ہوئی ہے؟

سرمایہ داری کا استیصال ہو جائے گا تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہو گا؟ صرف یہ کہ محنت پیشہ عوام مالدار

طبقوں کی خدائی سے آزاد ہو کر خود اپنے بنائے ہوئے خداؤں کے بندے بن جائیں گے۔ مگر کیا اس سے حقیقت میں آزادی، عدل اور امن کی نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا انسان کو وہاں یہ نعمتیں حاصل ہیں جہاں مزدوروں کے اپنے بنائے ہوئے خدا حکومت کر رہے ہیں؟

اللہ کی حاکمیت سے منہ موڑنے والے زیادہ سے زیادہ بہتر نصب العین جو پیش کر سکتے ہیں وہ بیش از یں نیست کہ دنیا میں مکمل جمہوریت قائم ہو جائے، یعنی لوگ اپنی بھلائی کے لیے آپ اپنے حاکم ہوں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ یہ حالت واقعی دنیا میں رونما ہو بھی سکتی ہے یا نہیں[1]، غور طلب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت اگر رونما ہو جائے تو کیا اس فرضی جنت میں انسان خود اپنے نفس کے شیطان، یعنی اُس جاہل اور نادان "خدا" کی بندگی سے بھی آزاد ہو جائے گا جس کے پاس خدائی کرنے کے لیے علم، حکمت، عدل، راستی کچھ بھی نہیں، صرف خواہشات ہی خواہشات ہیں، اور وہ بھی اندھی جابرانہ خواہشات؟

غرض دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی مصائب اور پریشانیوں کے جتنے حل بھی سوچے جا رہے ہیں ان سب کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے کہ خدائی یا حاکمیت بعض انسانوں سے سلب ہو کر بعض دوسرے انسانوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور یہ مصیبت کا ازالہ نہیں ہے بلکہ صرف اس کا امالہ ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ سیلابِ بلا اب تک جس راستہ سے آتا رہا ہے اُدھر سے نہ آئے بلکہ دوسرے راستہ سے آئے۔ اس کو اگر حل کہا جا سکتا ہے تو یہ ایسا ہی حل ہے جیسے دق کی بیماری کو سرطان سے تبدیل کر دیا۔ اگر مقصود محض دق کو دور کرنا تھا تو بے شک آپ کامیاب ہوئے، لیکن اگر اصل مقصد جان بچانا تھا تو ایک پیامِ اجل کو دوسرے پیکِ اجل سے تبدیل کر کے آپ نے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کی۔

خواہ ایک انسان دوسرے کا خدا بنے، یا دوسرے کی خدائی تسلیم کرے، یا آپ اپنا خدا بن جائے بہرحال

---

[1] تجربات شاہد ہیں کہ حقیقی جمہوریت آج تک دنیا میں کبھی قائم نہ ہو سکی اور عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہونا عملاً محال ہے۔

ان تمام صورتوں میں تباہی اور خسران کا اصل سبب جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ کیونکہ جو فی الواقع بادشاہ نہیں ہے وہ اگر بادشاہ بن بیٹھے، جو حقیقت میں بندہ اور غلام ہے وہ اگر اپنے آپ کو خواجگی و خداوندی کے مقام پر متمکن سمجھ لے، جو دراصل ذمہ دار اور مسئول رعیت ہے وہ اگر غیر ذمہ دار اور خود مختار حاکم بن کر کام کرنے لگے، تو اس ادعا کی اور ایسے ادعا کو تسلیم کرنے کی حقیقت ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اصلیت جو کچھ ہے وہ تو بہر حال وہی کی وہی رہے گی۔ حقیقت میں تو جو خدا ہے وہ خدا ہی رہے گا اور جو بندہ ہے وہ بندہ ہی رہے گا۔ مگر جب بندہ اس عظیم الشان بنیادی غلط فہمی پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اٹھائے گا کہ وہ خود حاکمِ اعلیٰ ہے یا کوئی دوسرا بندہ اس کا حاکمِ اعلیٰ ہے، اور جب وہ یہ سمجھ کر کام کرے گا کہ اس سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے جس کے سامنے وہ جواب دہ ہو اور اپنے امر و نہی میں جس کی رضا لینے کا محتاج ہو تو یقیناً اُس کی زندگی کی عمارت از سر تا پا غلط ہو کر رہ جائے گی اور اس میں راستی و صحت کو تلاش کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہ بات آخر کس طرح انسان کی عقل قبول کر لیتی ہے کہ خلق کسی کی ہو اور امر کسی اور کا ہو؟ پیدا کرنے اور پالنے والا کوئی ہو اور حکم کسی اور کا چلے؟ ملک کسی کا ہو اور بادشاہت کسی اور کی ہو؟

جس نے انسان کو بنایا، جس نے انسان کے لیے زمین کی قیام گاہ بنائی، جو اپنی ہوا، اپنے پانی، اپنی روشنی اور حرارت اور اپنے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے انسان کی پرورش کر رہا ہے، جس کی قدرت انسان کا اور اس پوری زمین کا، جس میں انسان رہتا ہے، احاطہ کیے ہوئے ہے اور جس کے حیطۂ قدرت سے انسان کسی حال میں نکل ہی نہیں سکتا عقل اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہی انسان کا اور اس زمین کا مالک ہو، وہی خدا اور رب ہو اور وہی بادشاہ اور حاکم بھی ہو۔ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں خود اس کے سوا اور کس کو حکومت و فرمانروائی کا حق پہنچتا ہے؟ کس طرح ایک مملوک یہ کہنے کا حق دار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے مملوکوں کا مالک ہے؟ صانع اور پروردگار کے سوا اپنی مصنوعات اور اپنے پروردوں کی ملکیت اور کس کے لیے جائز ہو سکتی ہے؟ کون اتنی قدرت رکھتا ہے، کس کے پاس اتنا علم ہے، کس کا یہ ظرف ہے کہ اس سلطنت

میں فرمانروائی کرسکے؟ اگر انسان اس مملکت کے اصلی سلطان کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت مانتا ہے، یا خود اپنی حاکمیت کا ادعا کرتا ہے تو یہ صریح واقعہ کے خلاف ہے۔ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ایک عظیم الشان جھوٹ ہے۔ سب سے زیادہ سفید جھوٹ۔ ایسا جھوٹ جس کی تردید زمین و آسمان کی ہر شے ہر وقت کررہی ہے۔ ایسے بے بنیاد دعوے، اور ایسی غلط تسلیم و اطاعت سے حقیقت نفس الامری میں ذرہ برابر بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو مالک ہے وہ مالک ہی رہے گا، جو بادشاہ اور حاکم ہے وہ بادشاہ اور حاکم ہی رہے گا، البتہ خود اس انسان کی زندگی ازسرتاپا غلط ہوکر رہ جائے گی جو واقعہ کے خلاف دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرکے، یا خود اپنی حاکمیت کا مدعی بن کر کام کرے گا۔ حقیقت اس کی محتاج نہیں ہے کہ تم اس کا ادراک کرو تب ہی وہ حقیقت ہو۔ نہیں! تم خود اس کے محتاج ہو کہ اس کی معرفت حاصل کرکے اپنی سعی و عمل کو اس کے مطابق بناؤ۔ اگر تم حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور کسی غلط چیز کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہو تو اس میں نقصان تمہارا اپنا ہے۔ تمہاری غلط فہمی سے حقیقت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوسکتا۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہو اس کو جزوی ترمیمات اور فروعی اصلاحات سے کبھی درست نہیں کیا جاسکتا۔ ایک جھوٹ کے ہٹ جانے اور اس کی جگہ دوسرے جھوٹ کے آجانے سے حقیقت میں کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تبدیلی سے طفل تسلی تو ہوسکتی ہے مگر غیر حق پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کا جو نقصان ایک صورت میں تھا وہی دوسری صورت میں بھی علیٰ حالہٖ باقی رہتا ہے۔

اس نقصان کو دور کرنے اور انسانی زندگی کو حقیقی فلاح و سعادت سے ہم کنار کرنے کی کوئی دوسری صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت سے کلیۃً انکار کیا جائے اور اس کی حاکمیت تسلیم کی جائے جو فی الواقع مالک الملک ہے۔ ہر اس نظام حکومت کو رد کردیا جائے جو انسانی اقتدار اعلیٰ کے باطل نظریہ پر قائم ہو، اور صرف اس نظام حکومت کو قبول کیا جائے جس میں اقتدار اعلیٰ اُسی کا رہے جو فی الحقیقت مقتدر اعلیٰ ہے۔ ہر اس حکومت کے حق حکمرانی کو ماننے سے انکار کردیا جائے جس میں انسان بذاتِ خود حاکم اور صاحب امر و نہی

ہونے کا مدعی ہو اور صرف اس حکومت کو جائز قرار دیا جائے جس میں انسان اصلی اور حقیقی حاکم کے ماتحت خلیفہ ہونے کی حیثیت قبول کرے۔ یہ بنیادی اصلاح جب تک نہ ہوگی جب تک انسان کی حاکمیت خواہ وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی ہو، جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دی جائے گی، اور جب تک انسانی حاکمیت کے غیر واقعی تصور کی جگہ خلافتِ الٰہی کا واقعی (Realistic) تصور نہ لے گا، اس وقت تک انسانی تمدن کی بگڑی ہوئی کل کبھی درست نہ ہوسکے گی، چاہے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت قائم ہو جائے، یا ڈکٹیٹرشپ کی جگہ جمہوریت متمکن ہو جائے، یا امپیریلزم کی جگہ قوموں کی حکومت خود اختیاری کا قاعدہ نافذ ہو جائے۔ صرف خلافت ہی کا نظریہ انسان کو امن دے سکتا ہے، اسی سے ظلم مٹ سکتا ہے اور عدل قائم ہوسکتا ہے، اور اسی کو اختیار کر کے انسان اپنی قوتوں کا صحیح مصرف اور اپنی سعی وجہد کا صحیح رُخ پاسکتا ہے۔ رب العالمین اور عالم الغیب والشہادہ کے سوا اور کوئی انسانی تمدن وعمران کے لیے ایسے اصول اور حدود تجویز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بے لاگ ہوں، جن میں جانب داری، تعصب اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو، جو ٹھیک ٹھیک عدل پر قائم ہوں، جن میں تمام انسانوں کے مفاد اور حقوق کا یکساں لحاظ کیا گیا ہو، جو گمان وقیاس پر نہیں بلکہ حقائقِ فطرت کے یقینی علم پر مبنی ہوں۔ ایسے ضابطہ کی نعمتوں سے انسان صرف اسی طرح بہرہ ور ہوسکتا ہے کہ وہ خود صاحبِ امر اور قانون ساز بننے کے زعم سے دستبردار ہو جائے، خدا پر اور اس کے بھیجے ہوئے قانونِ زندگی پر ایمان لائے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھتے ہوئے اس ضابطہ کو دنیا میں قائم کرے۔

اسلام انسانی زندگی میں یہی بنیادی اصلاح کرنے آیا ہے۔ اس کو کسی ایک قوم سے دلچسپی اور کسی دوسری قوم سے عداوت نہیں ہے کہ ایک کو چڑھانا اور دوسری کو گرانا اُس کا مقصود ہو، بلکہ اسے تمام نوعِ انسانی کی فلاح وسعادت مطلوب ہے جس کے لیے وہ ایک عالمگیر کلیہ وضابطہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ زاویہ سے کسی خاص ملک یا کسی خاص گروہِ انسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ وسیع نظر سے تمام روئے زمین کو اس کے تمام باشندوں سمیت دیکھتا ہے، اور چھوٹے چھوٹے وقتی حوادث ومسائل سے بالاتر ہو کر اُن اصولی وبنیادی مسائل

کی طرف توجہ کرتا ہے جن کے حل ہو جانے سے تمام زمانوں اور تمام حالات و مقامات میں سارے فروعی و ضمنی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ اسے ظلم کی شاخوں اور فساد کی فروعی شکلوں سے بحث نہیں ہے کہ آج ایک جگہ ایک شاخ کو کاٹنے پر زور صرف کرے اور کل دوسری جگہ کسی دوسری شاخ سے طبع آزمائی کرنے لگے، بلکہ وہ ظلم کی جڑ اور فساد کے سرچشمے پر براہ راست حملہ کرتا ہے تاکہ ان شاخوں کی پیدائش ہی بند ہو جائے اور جگہ جگہ آئے دن کی کاٹ چھانٹ کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل جن میں آج دنیا کی مختلف قومیں اور جماعتیں اُلجھ رہی ہیں، مثلاً یورپ میں ہٹلر کا طغیان ناز، یا حبش میں اٹلی کا فساد، یا چین میں جاپان کا ظلم، یا ایشیا و افریقہ میں برطانیہ و فرانس کی قیصریت، اسلام کی نگاہ میں اِن کی اور ایسے تمام مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی نگاہ میں ایک ہی سوال اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے پوچھتا ہے:

أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؟

"متفرق چھوٹے چھوٹے خداؤں کی بندگی اچھی ہے یا اس ایک اللہ کی جو سب پر غلبہ و تسلط رکھتا ہے؟

جو لوگ پہلی صورت کے پسند کرنے والے ہیں اسلام ان سب کو ایک سمجھتا ہے، خواہ وہ آپس میں کتنے ہی مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ ان کی ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد اسلام کی نظر میں ایک فساد کے خلاف دوسرے فساد کی جدوجہد ہے۔ اُن میں سے کسی کی دشمنی بھی نفسِ فساد سے نہیں ہے بلکہ فساد کی کسی خاص شاخ سے ہے اور اس لیے ہے کہ جس فساد کا جھنڈا ایک فریق نے بلند کر رکھا ہے وہ سرنگوں ہو اور اس کی جگہ وہ فساد سر بلند ہو جس کا جھنڈا دوسرا فریق اٹھائے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فریقین میں سے کسی کے ساتھ بھی اس کا اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جو اصل فساد کا دشمن ہو۔ اس کے لیے تو ایک چھوٹے رب کے پرستاروں اور دوسرے چھوٹے رب کے بندوں میں ترجیح کا سوال ہی نہیں۔ اس کی تو بیک وقت سب سے لڑائی ہے۔ وہ تو اپنا سارا زور صرف ایک ہی مقصد پر صرف کرے گا اور وہ یہ ہے کہ انسان کو متفرق غیر حقیقی ربوں اور الٰہوں کی بندگی سے نکالا جائے اور اس اللہ واحد قہار کی حاکمیت تسلیم کرائی جائے جو فی الحقیقت

رب الناس، ملک الناس اور الہ الناس ہے

لفظ "مسلمان" اگر کوئی بے معنی لفظ ہے اور محض عَلَم کے طور پر انسانوں کے کسی گروہ کے لیئے استعمال ہونے لگا ہے، تب تو مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیئے کہ اپنی زندگی کے لیے جو مقصد چاہیں قرار دے لیں اور جن طریقوں پر چاہیں کام کریں۔ لیکن اگر یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنھوں نے اسلام کو بطور مسلک و مشرب قبول کیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کے لیے کوئی نظریہ، کوئی مقصد اور کوئی طریق کار اسلام کے نظریہ، مقصد اور طریقِ کار کے سوا نہیں ہو سکتا۔ غیر اسلامی نظریہ اور پالیسی اختیار کرنے کے لیے حالاتِ زمانہ اور مقتضیاتِ وقت کا بہانہ کوئی بہانہ نہیں ہے۔ مسلمان جہاں جس ماحول میں بھی ہوں گے ان کو وقتی حوادث اور مقامی حالات و معاملات سے بہر حال سابقہ پیش ہی آئیگا۔ پھر وہ اسلام آخر کس کام کا اسلام ہے جس کا اتباع صرف مخصوص حالات ہی میں کیا جائے اور جب حالات دگرگوں ہوں تو اسے چھوڑ کر حسبِ سہولت کوئی دوسرا نظریہ اختیار کر لیا جائے؟ دراصل تمام مختلف حالات میں اسلام کے اساسی نظریہ اور بنیادی مقصد کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنا ہی مسلمان ہونا ہے۔ ورنہ اگر مسلمان ہر حادثہ اور ہر حال کو ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں اور ہمیشہ موقع و محل دیکھ کر ایک نئی پالیسی وضع کر لیا کریں جس کو اسلام کے نظریہ و مقصد سے کوئی لگاؤ نہ ہو، تو ایسے مسلمان ہونے میں اور نا مسلمان ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ایک مسلک کی پیروی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ جس حال میں بھی ہوں آپ کا نقطۂ نظر اور طریقِ کار اُس مسلک کے مطابق ہو جس کے آپ پیرو ہیں۔ ایک مسلمان سچا مسلمان اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ زندگی کے تمام جزئی معاملات اور وقتی حوادث میں اسلامی نقطۂ نظر اور اسلامی طریقہ اختیار کرے۔ جو مسلمان کسی موقع و محل میں اسلامی پہلو چھوڑ کر غیر اسلامی پہلو اختیار کرتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس موقع اور اس محل میں تو مجھے غیر اسلامی طریقہ ہی پر کام کر لینے دو، بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو مسلمان بن کر کام کرنے لگوں گا، وہ دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو اسلام کو وہ بجائے خود کوئی ایسا ہمہ گیر نظامِ زندگی ہی نہیں سمجھتا جو زندگی کے ہر معاملہ

اور زمانہ کی ہر گردش پر یکساں حاوی ہو سکتا ہو، یا پھر اس کا ذہن اسلام کے سانچے میں پوری طرح نہیں ڈھلا ہے جس کی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اسلام کے کلیات کو جزئی حوادث پر منطبق کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ مختلف احوال میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔

ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہار مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ٹرکی پر ترک، ایران پر ایرانی، اور افغانستان پر افغان حکمراں ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکم الناس علی الناس للناس[1] کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق[2] کا نظریہ رکھتا ہوں، اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہلِ فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے، اسی قدر ٹرکی اور دوسرے ملکوں پر اُن کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں اُن کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضَالِّيْن کے حکم میں ہیں تو یہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی تعریف میں آتے ہیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظامِ حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریۂ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا ورنہ بصورتِ دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض و ملعون ہوگا، کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کے بجائے عبداللہ خدائی کے

[1] 1. Government of the people, by the peopie, for the people

[2] 2. Rulership of God on Man with justice

منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نرا نیشنلزم ہے، اور یہ "مسلم نیشنلزم" بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی ملعون ہے جتنا "ہندوستانی نیشنلزم"۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا؟ یہ کونسا ایسا بڑا مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے یا حکم الناس کے آگے۔ اگر حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے تب تو ہندوستان کو اور زیادہ وسیع کیجیے، ہمالیہ کی دیوار کو بھی بیچ میں سے ہٹائیے اور سمندر کو بھی نظر انداز کر دیجیے تاکہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہندوستان میں شامل ہو سکیں۔ اور اگر یہ حکم الناس کے آگے جھکتا ہے تو جہنم میں جائے ہندوستان اور اس کی خاک کا پرستار، مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ یہ ایک ملک رہے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ اس بُت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرہ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔

مسلمان کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریز کی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لَآ اِلٰهَ کا ہم معنی ہو گا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں ہے، اس پر ہے کہ اس کے بعد اثبات کس چیز کا ہو گا؟ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس لیے ہے ـــــ اور مجاہدینِ حریت میں سے کون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ اس لیے نہیں ہے ـــــ کہ امپیریلزم کے الٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے الٰہ کو بُت خانۂ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا اور منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔

باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟ ان اللہ لایمحو السیئ بالسیئ ولکن یمحو السیئ بالحسن۔ ان الخبیث لایمحو الخبیث[1]۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین و مفتیان شرع مبین، دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں چوبائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہوّا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ انگریزی امپیریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں، ورنہ یہ دیکھتے کہ اصلی شیطان نہ یہ ہے نہ وہ، اصلی شیطان غیر اللہ کی حاکمیت ہے۔ اس سے نجات نہ پائی تو کچھ نہ پایا۔ لڑنا ہے تو اس کو مٹانے کے لیے لڑو۔ جو تیر چلانا ہے اس ہدف کی طرف شست باندھ کر چلاؤ۔ جس قدر قوت صرف کرنی ہے اسے محو کرنے پر صرف کر دو۔ اس کے سوا جس کام میں بھی تم اپنی مساعی صرف کرو گے وہ اسی طرح پراگندہ اور رائگاں ہو کر رہیں گی جس طرح اُن لوگوں کی مساعی جن کے متعلق قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهٖ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔

مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بیچاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی ہے، مگر حیرت

---

[1] یہ حدیث نبوی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بدی بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے مٹتی ہے۔ ایک ناپاک کو مٹا کر دوسرا ناپاک اس کی جگہ لے تو ناپاکی مٹی کہاں؟۔

اور ہزار حیرت ہے ان علماء کرام پر جن کا رات دن کا مشغلہ ہی قال اللہ وقال الرسول ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے پر بھی انھیں اس قطعی اور دائمی پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی جو مسلمان کے لیے اصولی طور پر مقرر کر دی گئی ہے۔ جن مسائل کو انھوں نے اہم اور اقدم قرار دے رکھا ہے، قرآن میں ہم کو ان کی فروعی اور ضمنی اہمیت کا بھی نشان نہیں ملتا۔ جن معاملات پر بے چین ہو کر انھوں نے دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس منعقد فرمائی اور تڑپ تڑپ کر تقریریں کیں، اس نوعیت کے معاملات کہیں اشارۃً بھی قرآن میں زیر بحث نہیں آتے۔ برعکس اس کے قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے: يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ، خواہ بابل کی سرزمین ہو، یا ارض سدوم، یا ملک مدین، یا حجر کا علاقہ، یا نیل کی وادی۔ خواہ وہ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو یا بیسویں یا دسویں۔ خواہ وہ غلام قوم ہو یا آزاد، خستہ و درماندہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بام عروج پر، ہر جگہ، ہر دور میں، ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے لیڈروں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ "اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ حضرت ابراہیم نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمھارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراک عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے، كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کے پاس جا کر اَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ کا مطالبہ کرنے سے پہلے اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا اعلان کیا اور هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى کی دعوت دی اور اسے آگاہ کیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔ حضرت عیسیٰ نے جن کی قوم رومیوں کی غلام ہو چکی تھی، بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومن امپیریلزم کے خلاف جنگ آزادی کے جھنڈے کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں کسی اور دنیا کے

نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی۔ پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر لیڈر نے ہر ملک اور ہر زمانہ میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ ام المسائل تھا اور وہ اسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔

اب یا تو یہ کہہ دیجیے کہ اسلامی تحریک کے وہ لیڈر جو خدا کی طرف سے آئے تھے سب کے سب عملی سیاسیات سے نابلد تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے معاملات میں کونسی چیز مقدم اور کونسی موخر ہونی چاہیے، اور انھیں خبر نہ تھی کہ آزادی کے لیے جدوجہد کس طرح کی جاتی ہے اور ملکی معاملات کو حل کرنے کی کیا تدبیریں ہیں؛ یا پھر یہ تسلیم کیجیے کہ اس دور میں جو حضرات اسلام کے نمائندے اور مسلمانوں کے قائد و رہنما بنے ہوئے ہیں وہ جزئیات شرع پر کتنا ہی عبور رکھتے ہوں، بہرحال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اس تحریک سے ہے جس کے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظام فکر اور ایک خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظام فکر اور طریق کار وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوں، اور ہمارے گرد و پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے لیے مقصد و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانے میں چلتے رہے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔ ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے انھوں نے دیکھا۔ ہمارا معیار قدر وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا۔ اور ہماری اجتماعی

پالیسی انہی خطوط پر قائم ہونی چاہیے جن پر انھوں نے قائم کی تھی۔ اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طرز عمل اختیار کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمارے مرتبے سے فروتر ہے کہ ہم اُس تنگ زاویہ سے معاملات دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست، یا ایک وطن پرست، یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراکی، ان کو دیکھتا ہے۔ جو چیزیں ان کے لیے بلند ترین منتہائے نظر ہیں وہ ہمارے لیے اتنی پست ہیں کہ ادنیٰ التفات کی بھی مستحق نہیں۔ اگر ہم ان کے سے ڈھنگ اختیار کریں گے، انہی کی زبان میں باتیں کریں گے، اور انہی گھٹیا درجے کے مقاصد پر زور دیں گے جن پر وہ فریفتہ ہیں تو اپنی وقعت کو ہم خود ہی خاک میں ملا دیں گے۔ شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بزغالوں کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی دست بردار ہو گیا۔ اب وہ اس کی توقع کیسے کر سکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اس کی وہ پوزیشن تسلیم کریں گے جو شیر کی ہونی چاہیے؟ یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے مطالبے، یہ اکثریت و اقلیت کے نوحے، یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریزی سلطنت اور والیانِ ریاست کے ظلِ عاطفت میں قومی مفاد کے تحفظ کی تدبیریں، اور دوسری طرف یہ آزادیِ وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے طرز دل میں امپیریلزم کی مخالفت، یہ سب ہمارے لیے بکری کی بولیاں ہیں۔ یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط پوزیشن اختیار کرتے ہیں اور اپنی پوزیشن اس قدر غلط طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے۔ ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے ہو کر تمام دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت مٹا دیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں۔ یہ شیر کا سا منصب ہے اور اس منصب کو ادا کرنے کے لیے کسی قسم کی خارجی شرائط درکار نہیں ہیں بلکہ صرف شیر کا دل درکار ہے۔ وہ شیر شیر نہیں ہے جو اگر پنجرے میں بند ہو تو بکری کی طرح ممیانے لگے، اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرت تعداد کو دیکھ کر یا بھیڑیوں کی چیرہ دستی دیکھ کر اپنی شیریت بھول جائے۔

اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لے کر آیا ہے۔ اُس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے۔ اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں، یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرماں روائی اور جمہور کی حکومت خوداختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اس کی رعیت پر صرف اُسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتداء سے لے کر آتے رہے ہیں۔ اسی ایک مقصد پر انھوں نے اپنی تمام سعی وجہد کو مرکوز کیا ہے۔ اور مسلمان، جو انبیاء کے وارث اور ان کے پیرو ہیں، ان کے لیے بھی اِس کے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انھوں نے اس نصب العین اور اس راہ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اس اعتراض کو سن کر اصولی حیثیت سے تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔

لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں:

"آزادی پسند" علماء اور اُن کے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومتِ الٰہیہ کے لیے جد و جہد کرتے، اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں۔ اکثریت غیر مسلم ہے، حکومتِ الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اس کی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر، انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کریں گے اور اپنے نصب العین کے لیے جد و جہد شروع کر دیں گے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ اس وقت قابلِ عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اول تو قلیل التعداد ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے، اور مزید برآں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دور ہٹاتی ہے، مگر سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم "ہندوستانی قوم" میں شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اس مقصد میں اس کے کامیاب ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھو دیں، پھر بھلا حکومتِ الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جا سکے گا۔ لہٰذا سردست اس کے سوا کوئی قابلِ عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں، اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح

ہم بھی ملکر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصور جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کرلیں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آجائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کرکے رفتہ رفتہ حکومتِ جمہوریہ کو حکومتِ الٰہیہ میں تبدیل کرلیں گے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومتِ الٰہیہ کے راستہ میں انھیں اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انھوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریقِ کار (Technique) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہوجاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک نبی توم بلکہ ایک نبی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لے کر اٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اس کے ساتھ ہوجاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومتِ الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا سمندر اس کے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اس قہر و تسلط کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جس کا نوحہ کرتے کرتے ہمارے "مسلم قوم پرست" بھائیوں کے آنسو خشک ہوئے جارہے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجۂ ظلم و شکنجۂ قہر میں ان کو کستی تھی، اُس کو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریز فرماں رواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جاسکتی جن کے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی

رات دن رد کیا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہر حال رسول اور اصحاب رسول حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اس مقصد میں ناکام ہوئے ہیں، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی تھا، انھوں نے آخری سانس تک اسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگار ماحول کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے، نہ فراہم ہو گا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے۔ اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر ہی کی کوئی حاجت ہے کہ اُس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت تسلیم کرنے والے سب انسان اس کے لیے یکساں ہیں، سب کی اس سے اور اس کی سب سے یکساں لڑائی ہے۔ مسیحؑ سے رومیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اس سے زیادہ ہولناک برتاؤ وہ تھا جو ابراہیمؑ سے ان کی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پاتے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جد و جہد کر رہی ہو وہاں تو طبعاً بہ اسی قسم کے مسائل در پیش ہوتے ہیں۔ اُس کے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس

ملک میں وہ آباد ہے وہاں اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اس کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اس کی معاشی حالت کیسی ہے؟ اس کے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھروں کا؟ انہی سوالات کے جوابات پر اس کا مستقبل منحصر ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اس کو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی خاص قوم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک دعوت لے کر اُٹھے، اس کے سامنے ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اُس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اُس کی کامیابی و ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم فطرتِ انسانی کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس کی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آرہی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کے سوچنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے درمیان خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جن کا تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں، اُس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچتی ہیں، ایسے مسائل میں اُلجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اس طرزِ فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو سدِ راہ پاتے ہیں جو محض قومی مقاصد ہی کے لیے سدِ راہ ہوا کرتی ہیں۔ ان لوگوں نے آج تک ان دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر فیصلہ کیا کہ دراصل یہ ہیں کیا۔ اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی بھی تک اپنے لیے متعین نہ کر سکے جو تناقض سے خالی اور اُلجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت، یا ہندویت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان کی طرف دوسروں کو دعوت دی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انہیں پیش کیا جا سکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے جے لگے دائرے

ہیں۔ ان دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہو سکتی ہے انہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو اِن دائروں کے اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اس کی برتری کے معاملہ میں اس کا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ تو صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلۂ کار بنالیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لا کر جرمنوں کا ولی حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار کر کے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اس کی مقتضی ہو۔ اور جہاں ان کے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلاتِ جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقت ور ہو وہ اُسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہو گئے؟ فن لینڈ اور رومانیا کو روس اور جرمنی سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہٰذا جس کی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اُس نے کمزور کو دبا لیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اُٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اس کو دوست ملتے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنایا ہوا ایک ایسا گروہ (Group) ہیں جس کی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابلِ تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی انہی قومی اغراض و مقاصد

کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرۃً غیر ممکن ہوتا ہے ؟ کیا ہمارے مقاصد اُسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جن کا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے ؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (National State) ہے جس کے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرت تعداد ہوا کرتی ہے ؟ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت National Minority کی رہ جاتی ہے جس کے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا ؟ کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے ؟ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہل وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے ؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے تو بلا شبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اس وقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا سہارا لے کر ہندو امپیریلزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی بھی صحیح جس کی بنا پر حق اور اصول سے قطع نظر کر کے ہر اُس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے، قومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہش مند ہو، ان تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدبیریں اختیار کر سکتی ہے ؟ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومتِ الٰہیہ قائم کر سکیں گے، حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

دراصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اُصولی تحریک ہی میں ہے جو انسان کو بحیثیت انسان خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اس کی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔

قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی طاقت کا انحصار اپنے پیرووں کی تعداد یا ان کے وسائل پر نہیں ہوتا۔ ایک اکیلا آدمی اس کو اٹھانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں اُن پر وہ صرف اپنی توپ تفنگ سے ہی آتش باری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے۔ خون کے پیاسے دشمنوں میں سے وہ اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سپاہی، جنرل، ماہرینِ فنون، سرمایہ دار، صناع اور کاریگر سب انہی میں سے اس کو مل جاتے ہیں اور بے سروسامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اس کے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھیر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس کے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح گھل گھل اس آب رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے اقلیت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں۔ وہ اس کی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور باوسیلہ قوم کی طاقت اس کی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کر سکیں۔ اُسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں، مگر جب فطرتِ انسانی پر لگا ہوا زنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے کہ

همه آهوان صحرا سر خود نهاده بر کف　　　بامید آنکه روزے بہ شکار خواهی آمد

مسلمان قرآن اور سیرت رسول کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوعیت کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے رہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پا کر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو "قوم" کہتے کہتے وہ سب محدودیتیں بھی انھوں نے اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کر لی ہوں جو ایک قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں؟

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصل حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیروؤں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد کانفرنس، سب کی اس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرفِ باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھیرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ اُن ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنیاد پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیانِ ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان سب کے سامنے پیش کریں گے۔ جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلا لحاظ اس کے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اس تحریک کو لے کر اُٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد و اغراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹا لیں جن سے ہمارے حقیر دنیوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندوستانیت کا تعصب ہو گا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہرے ہو جائیں۔ اگر ہم نام نہاد مسلم قومیت کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھُل جائے۔ اگر ہم حیدرآباد، بھوپال، بہاول پور اور رامپور جیسی ریاستوں کی حمایت محض اس لیے کریں کہ اُن کے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا ملِ جاتا ہے، تو کوئی احمق ہی ہو گا جو اس کے بعد بھی یہ باور کرلے گا کہ ہم اسلام کے نظریۂ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومتِ الٰہی قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری ادارات میں مسلمانوں کی

نمائندگی پر جھگڑا کریں تو ہماری اس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصولِ اسلام کی فرماں روائی قائم کرنے اٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسبِ آبادی کے لحاظ سے تقسیمِ ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرے سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک وطنی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی، صحتِ عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائے گی۔ اس راستہ پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ہمیں بہت نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اُٹھائے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے نہ چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سیدنا مسیحؑ کے قول کے مطابق جُبّہ جاتا ہے تو کُرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔

اسلام کی راہِ راست اور اُس سے انحراف کی راہیں

مسلمانوں میں سے جو لوگ[۱] پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جمائے ہوئے ہیں، اور جو[۲] انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی پر اپنی آئندہ کی تمام امیدوں کا انحصار رکھتے ہیں، اور جو[۳] ان دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب لوگ جھجکتے ہیں، مشکلات کا ایک بہت بڑا پہاڑ ان کو اس راستہ میں حائل نظر آتا ہے اور اُس کو دُور سے دیکھ کر یہ دائیں یا بائیں جانب مُڑ جاتے ہیں تاکہ پھیر کے راستوں سے نکل جائیں۔ حالانکہ میں علی وجہ البصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی نصب العین تک کسی پھیر کے راستہ سے پہنچنا غیر ممکن ہے۔ اس کی طرف اگر پیش قدمی کی جاسکتی ہے تو براہِ راست ہی کی جاسکتی ہے، اور جو مشکلات اِس راستہ میں نظر آتی ہیں وہ ناقابلِ عبور نہیں ہیں بشرطیکہ ان کو صحیح طور سے سمجھنے اور دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اوپر کے فقرے میں جو مجمل دعویٰ میں نے کیا ہے اب میں اس کا تجزیہ کر کے ایک ایک جزء پر الگ الگ بحث کروں گا۔

۱۔ اصل اسلامی نصب العین کیا ہے؟

۲۔ اس کی طرف پیش قدمی کا سیدھا راستہ کونسا ہے؟

۳۔ اس راستہ میں جو مشکلات نظر آتی ہیں وہ کیا ہیں؟

۴۔ ان مشکلات کو دیکھ کر پھیر کے راستے کون کون سے اختیار کیے جا رہے ہیں؟

۵۔ ان مختلف راستوں میں غلطی کیا ہے اور یہ اصل مقصود تک کیوں نہیں پہنچا سکتے؟

۶۔ مشکلات کی حقیقی نوعیت کیا ہے اور وہ کس طرح دور ہو سکتی ہیں؟

یہ سوالات ہیں جن پر مجھے اس مضمون میں مختصراً بحث کرنی ہے۔

۱۔ اسلامی نصب العین

پہلے سوال کا جواب قرآن مجید میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

"وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ یہ کام مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اس آیت میں الھدیٰ (ہدایت) سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ انفرادی برتاؤ، خانگی نظام، سوسائیٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمت عملی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسانی زندگی کے لیے صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے، یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا کر بھیجا ہے۔

دوسری چیز جو اللہ کا رسول لے کر آیا ہے وہ دینِ حق ہے۔ دین کے معنی اطاعت کے ہیں۔ کیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ اس کا اصل معنی موضوع لہٗ نہیں ہے بلکہ اس کو دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان خیال و عمل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ در اصل دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانۂ حال میں "اسٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرنا، یہ "اسٹیٹ" ہے۔ یہی "دین" کا مفہوم بھی ہے۔ اور "دینِ حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک نئے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام،

بلکہ حاکمیت و اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے۔

پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظام اطاعت (دین) اور اس قانون حیات (الہدیٰ) کو پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ پوری جنس دین سے کیا مراد ہے؟ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کر رہا ہے وہ سب "جنس دین" کی مختلف انواع ہیں۔ بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا، ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا، رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا، پیرووں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا، یہ اور ایسی ہی دوسری بے شمار اطاعتیں بحیثیت مجموعی ایک نظام اطاعت بناتی ہیں اور اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظام اطاعت اپنے تمام اجزا سمیت ایک بڑی اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جائے، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں، اُن سب کو منضبط (Regulate) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو، اور اس بڑی اطاعت اور اس ضابطہ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے، خواہ شرک کرنے والے اس پر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔ شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں۔ جہاں تک اللہ کے قانون طبعی (Law of Nature) کا تعلق ہے، ہر انسان طوعاً و کرہاً اس کی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ اس اطاعت کے بغیر تو اس کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے دائرۂ اختیار کا تعلق ہے، اس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کسی حصہ میں خدا کے بھیجے ہوئے قانون اخلاقی و شریعت) کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی دوسرے حصہ میں اپنے نفس یا دوسروں کی اطاعت بجا لاتے ہیں۔ اسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری اطاعتوں کو شریک کرنا ہے، اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں، ان کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکلیہ اللہ کے لیے خالص کر دیں، خواہ نادانی کے سبب سے، یا اخلاقی کمزوری

کے سبب سے، بہر حال وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں، لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی مزاحمت کے باوجود اپنے مشن کو پورا کرے۔

۲- اسلامی نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین، اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راہِ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو "الہدیٰ" اور دینِ حق کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں، اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنا لیں، اُن کا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے۔ پھر یہ جتھا تمام اُن اخلاقی، علمی اور مادی ذرائع سے جو اس کے امکان میں ہوں، دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرے یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں اُن سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے نظامِ اطاعت پر وہی الہدیٰ اور دینِ حق غالب آ جائے۔

اس راہِ راست کا ہر جز قابلِ غور ہے:

پہلا جز یہ ہے کہ انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہونی چاہیے۔ ہر وقت جاری رہنی چاہیے۔ اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے۔ قوموں اور نسلوں اور ملکوں کے باہمی جھگڑے، خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی بحثیں، غیر الٰہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایسے نظامِ فاسد کی خود غرضانہ حمایت کرنا، یا کسی نظامِ فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ میل نہیں کھاتیں بلکہ صریح طور پر اس کے منافی اور اس کے لیے مضرت رساں ہیں۔ پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوتِ حق کی خدمت انجام دینی ہو تو اسے ان تمام جھگڑوں اور بحثوں سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنی دعوت کے ساتھ

کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قضیے کو شامل نہ کرنا چاہیے۔

دوسرا جز، یہ ہے کہ جتھا صرف اُن لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ واقعی شریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانونِ زندگی بنالیں۔ رہے دوسرے لوگ جو اس طرزِ خیال یا اس طرزِ زندگی کے محض معترف ہوں، یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں، تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتھے کے لیڈر کیا معنی، کارکن بھی نہیں بن سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو جس درجہ میں بھی اس کا ہمدرد یا بیرونی معاون بن جائے بسا غنیمت ہے، مگر ارکان اور ہمدردوں کے درمیان جو حقیقی فرق و امتیاز ہے اُسے کسی حال میں بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

تیسرا جز، یہ ہے کہ براہِ راست غیر الٰہی نظامِ اطاعت پر حملہ کیا جائے، تمام کوششوں کا مقصود صرف اس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو، اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کو مقصود بنا کر اس کے پیچھے قوتیں ضائع نہ کی جائیں۔

۳- مشکلات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں، قریب قریب اُن سب کا دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا نصب العین اسلامی نصب العین ہی ہے۔ مگر ان سب نے اُس راہِ راست کو چھوڑ دیا ہے جس کی تشریح ابھی میں نے بیان کی ہے وہ نہ تو "الہدیٰ" اور "دینِ حق" کی خالص، بے آمیز دعوتِ عام دیتی ہیں۔ نہ اس پارٹی کی تشکیل کرتی ہیں جس کی قیادت و رکنیت صرف اُن لوگوں تک محدود ہو جو واقعی اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خاص کرتے ہوں۔ اور نہ وہ غیر متعلق مقاصد کو چھوڑ کر صرف اس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا ہدف بناتی ہیں جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ راہِ راست کے ان تینوں اجزاء سے یہ سب جماعتیں منحرف ہو گئی ہیں۔

اس انحراف نے مختلف جماعتوں کے مسلک میں کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں؟ اس کی تفصیل میں بعد میں بیان کروں گا۔ پہلے میں اس انحراف کا سبب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے میں تین بڑی مشکلات نظر آتی ہیں جن کا کوئی حل ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

(۱) سب سے پہلی مشکل جو ان کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ الہدیٰ اور دینِ حق کی طرف دعوتِ عام کا نتیجہ خیز اور کامیاب ہونا موجودہ حالات میں اُن کو محال نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری تحریکیں تو محض سیاسی تمدنی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور جن لوگوں کو ان کا تجویز کردہ حل اپیل کرتا ہے وہ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کیے بغیر ان تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام محض دنیوی مسائل کا حل پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد کا ایک نظام اور عبادات اور قوانینِ شرعیہ کا ایک ضابطہ بھی پیش کرتا ہے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ لوگ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کر دیں۔ پھر یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ اسلام کی دعوتِ عام اُس طرح پھیل سکے گی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔

(۲) دوسری مشکل جو اس راستہ میں انھیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف لوگوں میں شدید تعصبات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دوسری تحریکوں کا پھیلنا آسان ہے کیونکہ ان کے خلاف تعصبات موجود نہیں ہیں، مگر اسلام کا پھیلنا مشکل ہے کیونکہ اس کا نام سنتے ہی ماضی اور حال کے تعصبات کا ایک طوفان اُٹھ جاتا ہے۔

(۳) تیسری مشکل ان کی نگاہ میں یہ ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی ایک قوم یہاں موجود ہے جو "قومیت" کے اعتبار سے تو "مسلمان" ہے، مگر اس کا اخلاقی مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے کہ وہ اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کر سکے۔ اس قوم کو لے کر اس راستہ پر چلنا چاہیں تو چل نہیں سکتے۔ اس کو چھوڑ کر چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ سوال بھی دماغ کو پریشان کرتا ہے کہ اگر تمام مقاصد کو نظر انداز کر کے صرف ایک حکومتِ الٰہی کے مقصد پر توجہات مرکوز کر دی جائیں تو آخر موجودہ سیاسی حالات اور آئندہ کے دستوری تغیرات میں مسلمانوں کے قومی مفاد کا کیا حشر ہو گا۔

انحراف کی راہیں

یہی تین مشکلات ہیں جن کو اس راہ میں حائل دیکھ کر لوگ دائیں اور بائیں رُخ پر راستہ کترا کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جزئیات کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے نظریات اور عملی طریقوں میں جو اختلافات ہیں ان کو نظر انداز کر کے بڑی اور اصولی تقسیم اگر کی جائے تو یہ سب تین گروہوں میں منقسم ہو جاتے ہیں:

ایک وہ گروہ جو کہتا ہے کہ پہلے ہمیں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ موافقت کر کے اس ملک کو انگریزی اقتدار

سے آزاد کرالینا چاہیے تاکہ پہلی ایک مشترک جمہوری سٹیٹ قائم ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم بتدریج اس اسٹیٹ کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشش کریں گے۔

دوسرا وہ گروہ جس کا خیال ہے کہ پہلے انگریزی اقتدار کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں مستقل ہندو اکثریت کے تسلط کا سدباب کرنا چاہیے، اور ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس ملک میں ایک جمہوری اسٹیٹ کے بجائے دو اسٹیٹ قائم ہوں، ایک وہ اسٹیٹ جس میں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے اور دوسرا وہ اسٹیٹ جس میں ہندو اکثریت کی وجہ سے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جائے مگر زیادہ سے زیادہ جو آئینی تحفظات ممکن ہیں ان کے ذریعہ سے مسلمانوں کی پوزیشن محفوظ ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم مسلم اکثریت والے اسٹیٹ کو بتدریج اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کر لیں گے اور پھر ہندو اکثریت والے اسٹیٹ میں تغیر و اصلاح کی کوشش کریں گے۔

تیسرا وہ گروہ جو موجودہ حالات میں دعوتِ عام اور ایک انقلابی پارٹی کی تشکیل کو آسان بنانے کے لیے اسلام کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو جائے جو اسلامی عقائد اور عبادات اور نظامِ شریعت کی بندشوں سے گھبراتے ہیں۔ اس گروہ نے اگرچہ ابھی کوئی مستقل جماعتی صورت اختیار نہیں کی ہے، مگر مجھے معلوم ہے کہ اس طرزِ خیال کے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں اور ان کی تجویزیں اس وقت حالتِ جنینی سے گزر رہی ہیں۔

۵۔ منحرف راستوں کی غلطی

اب میں ان میں سے ایک ایک گروہ کے طریقہ پر الگ الگ تنقید کر کے بتاؤں گا کہ ان طریقوں میں غلطی کیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے اسلام کی راہِ راست سے کس طرح انحراف کیا ہے، اور ان پھیر کے راستوں سے اصلی اسلامی نصب العین تک پہنچنا ابداً غیر ممکن الوقوع کیوں ہے۔

آزادیٔ ہند کو مقدم رکھنے والے

پہلا گروہ زیادہ تر علماء اور مذہبی خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور بالعموم اس گروہ کے لوگ دوسرے گروہوں کی بہ نسبت زیادہ مذہبی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے انحراف پر مجھ کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔

ان حضرات نے مذکورہ بالا مشکلات سے خوف زدہ ہو کر یہ خیال قائم کر لیا کہ موجودہ حالات میں اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی نہیں کی جاسکتی، اس لیے انھوں نے اپنی کوششوں کا مقصود یہ ٹھیرایا کہ "ہندوستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے"۔ مقصود بدل جانے سے لامحالہ راستہ بھی بدل گیا۔ اسلام کی راہ راست کے تین اجزاء جو میں نے بیان کیے ہیں، ان کا راستہ ہر جز میں اس سے مختلف ہے:

(۱) دعوت کے باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلایا جائے۔ مگر یہ ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بلاتے ہیں کہ تم خود مالک الملک بنو۔ یہ غیر الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ باشندگانِ ملک کی خود اختیاری اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرک ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدارِ اعلیٰ اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ مخالفِ اسلام دعوت ہے۔ ان کے نزدیک انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں جمہورِ اہلِ ہند کا اختیار، اور انگریزی تشریعات کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی قانون سازی قابلِ ترجیح ہے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں بغاوت، یکساں کفر اور یکساں طغیان و معصیت ہیں۔ پھر یہ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان قومی و وطنی عداوت و منافست کی آگ بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں، حالانکہ اسلام کی دعوتِ عام کے راستہ میں یہ رکاوٹ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں اپنی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا جھگڑا انگریز سے (۱) اس بات پر نہیں ہے کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہو کر دوسرے ملک پر حکومت کیوں کرتا ہے۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کی اطاعت کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ بعینہٖ اسی بات پر اس کا جھگڑا ہندوستانی سے بھی ہے۔ وہ دونوں کو ایک ہی بات کی طرف بلاتا ہے۔ ایک کا حامی بن کر دوسرے سے لڑنا اس کی حیثیت کے منافی ہے کیونکہ اگر وہ ہندوستانی اور انگریز کے وطنی و قومی جھگڑے میں ایک کا طرفدار اور دوسرے کا مخالف بن جائے تو انگریز کے دل کا دروازہ اُس کی دعوت کے لیے بند ہو جائے گا۔ اب

(۱) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرے یا اس کے حقوق تلف کرے تو اسلام مظلوم قوم کی حمایت نہ کرے گا
(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ ایک طرف اسلام کے داعی بنتے ہیں اور دوسری طرف اس وطنی و قومی جھگڑے میں فریق بھی بنتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مفاد کو ہندوستانیت کے مفاد پر قربان کرتے ہیں۔

ان تمام بنیادی غلطیوں کے ساتھ یہ حضرات کبھی کبھی اسلام کی تبلیغ بھی فرمایا کرتے ہیں۔ مگر ایسی تبلیغ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ایک ساز سے دو بالکل مختلف آوازیں سن کر اور ایک زبان سے دو قطعی متضاد باتیں سماعت کر کے آخر کون متاثر ہو سکتا ہے؟

(۲) تشکیلِ جماعت کے باب میں یہ حضرات اس سے بھی زیادہ مختلط ہیں۔ اول تو دعوت کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ہی جماعت کی ترکیب اور اجزائے ترکیبی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ پھر "مسلمان قوم" کے تخیل نے پریشان خیالی کے لیے ایک اور وجہ بھی پیدا کر دی ہے۔ ان اسباب سے یہ ہر قسم کے رطب و یابس آدمی اکٹھے کر لیتے ہیں، اور اُن آدمیوں کے اقوال و افعال میں بیک وقت بیسیوں قسم کی متضاد باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک متحد المزاج نظریہ کی حمایت کے لیے آپ اُٹھیں تو لامحالہ آپ اپنی پارٹی کے لیے انہی آدمیوں کا انتخاب کریں گے جو یکسوئی کے ساتھ اُس خاص نظریہ کے متبع ہوں۔ بخلاف اس کے ایک مخلوط اور غیر معین مزاج رکھنے والے نظریہ کو لے کر جب آپ اٹھیں گے تو آپ کا معیارِ انتخاب لازماً اُن قیود سے آزاد ہو جائے گا جو متحد المزاج نظریہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ کچھ مدت ہوئی مجھے ایک مجلس میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی ذمہ دار جمعیت کی مقامی شاخ کو منظم کرنے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد جو بات قرار پائی وہ یہ تھی کہ رکنیت کے فارم طبع کرا لیے جائیں اور پندرہ دن کے اندر زیادہ سے زیادہ ممبر بھرتی کر کے ارکان کا ایک جلسہ عام کر دیا جائے جس میں عہدہ داروں کا انتخاب ہو جائے۔ لیجیے بس جمعیت کی مقامی شاخ منظم ہو گئی۔ اس طرح بھانت بھانت کے آدمی محض رکنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اور ۴ر سالانہ فیس ادا

(بقیہ سابق) بلکہ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر دونوں قوموں میں جو نزاع ہو گی اسلام اس میں کوئی حصہ نہ لے گا، وہ ظالم کو ملامت کرے گا نہ اس لیے کہ وہ فلاں قوم کا آدمی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور اسی طرح وہ مظلوم کی حمایت بھی اس حیثیت سے نہ کرے گا کہ وہ فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ مظلوم ہے۔

کرکے ان جماعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں، پھر انہی آدمیوں کے ووٹوں سے منتخب ہوکر وہ لوگ برسر کار آتے ہیں جن کا کام رہنمائی دسربراہ کاری ہوتا ہے اور ایسے ہی لوگوں کی متفقہ خواہشات سے پالیسیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کیا کوئی شخص توقع کرسکتا ہے کہ جماعتی تشکیل کے اس طریقے سے کبھی اسلامی نصب العین کی طرف بھی کوئی پیش قدمی کی جاسکتی ہے؟

(۳) اسی طرح تیسرے جزء میں بھی ان کا طریقہ اسلام کی راہ راست سے ہٹا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اسلام براہ راست غیر اسلامی نظام اطاعت پر حملہ کرتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مساعی کو حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات پر مرکوز کردیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس یہ لوگ اپنی سعی و جہد کا رُخ برطانوی نظام اطاعت کی تخریب اور حاکمیت عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہ صریح انحراف ہے صراط مستقیم سے۔ اس انحراف پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظام اطاعت اسلامی نصب العین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، ہم تنہا اس رکاوٹ کو دور نہیں کرسکتے، اس لیے پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دور کریں، پھر اصل منزل مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ آسان ہو جائے گا۔ مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک نظام اطاعت یا دین کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نظام اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ نفوس انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کردیا جائے۔ اگر ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظام اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب صرف اسی طرح ممکن ہے کہ آپ باشندگان ہند کے دلوں میں حاکمیت انگریز کے بجائے خود اپنی حاکمیت کے برحق ہونے کا تخیل اور عملاً مالک الملک بن جانے کا عزم پوری شدت کے ساتھ پیدا کردیں۔ برعکس اس کے اگر آپ ہندوستان میں الٰہی نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ عوام الناس کو خود اپنی حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہونے اور غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے پر آمادہ کریں اور اللہ کے مالک الملک ہونے کا عقیدہ ان کے دلوں میں اتنی قوت کے ساتھ بٹھائیں کہ وہ اس کی حاکمیت کے آگے برضاء و رغبت سر جھکا دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد الٰہی نظام اطاعت کا قیام ہے وہ کس طرح بحالت ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ذریعہ کے طور

یہ تدبیر اختیار کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دیں کہ اس کے زور سے دینِ انگریزی کی مضبوط جمی ہوئی جڑ اُکھڑ جائیں اور دینِ جمہوری کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں ؟ جہاں عامۂ خلائق کے دلوں میں اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور عزم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو کیا وہاں لوگوں کو خداوندِ عالم کے آگے اپنی حاکمیت سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ کرنا موجودہ انگریزی حاکمیت کی جڑیں اُکھاڑنے سے کچھ کم مشکل ہے ؟ کیا امریکہ، جاپان، جرمنی اور انگلستان جیسے اصطلاحاً "آزاد" ممالک میں حکومتِ الٰہی کا قیام اس سے کچھ کم دشوار ہے جتنا ہندوستان جیسے اصطلاحاً غلام ملک میں دشوار نظر آتا ہے ؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برطانوی اقتدار کی جگہ ہندوستانی اقتدار کا قیام آخر کس معنی میں حکومتِ الٰہی کے قیام کی طرف ایک گونہ پیش قدمی ہے۔

تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تدبیر عملاً کارگر ہو سکتی ہے تب بھی میں اس کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہوں ـــ لازم نہیں کہ ہر تدبیر جو کارگر ہو وہ صحیح بھی ہو ـــ دراصل یہ سخت ناپاک تدبیر ہے جسے اختیار کرنے کا خیال بھی ایک مسلمان دل میں نہیں لا سکتا۔ جو شخص درحقیقت پوری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک الملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو وہ آخر کس دل سے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ایمان کے خلاف عوام الناس میں اس عقیدے کی تبلیغ کرے کہ تم خود مالک الملک ہو ؟ جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی صرف حدود اللہ کی پابند ہونی چاہیے اور حکومت وہ ہونی چاہیے جو اللہ کے سامنے جواب دہ ہو وہ کیونکر اپنی کوششوں کا مقصود یہ قرار دے سکتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر حدودِ جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت جمہور کے سامنے جواب دہ ہو ؟ کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے عقیدے کی اشاعت یا حمایت میں کھل سکتی ہے جس کو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے، اور کس طرح وہ اس چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اس کے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے ؟

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ تو محض اس امر کا ثبوت ہے کہ ان لوگوں کا راستہ اسلام کی راہِ راست سے منحرف ہے۔ رہی یہ بات کہ اس پھیر کے راستے سے یہ لوگ کبھی اسلام کے نصب العین تک نہیں پہنچ سکتے، تو اس دعوے پر میرے

پاس یہ دلیل ہے کہ جن مشکلات سے خوفزدہ ہو کر انھوں نے یہ پھیر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہندوستان کے انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہیں گی۔ اوپر میں نے مشکلات کی جو تشریح کی ہے ان پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں سے کوئی مشکل بھی خود مختار ہندوستان کے دور میں دُور ہو جائے گی؟ اگر نہیں، تو جو لوگ آج ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی حکمت اور ہمت نہ رکھنے کی وجہ سے راستہ کترا کر نکل رہے ہیں وہ کل بھی اسی وجہ سے اصل مقصدِ اسلامی کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے جی چرائیں گے۔ خوب جان لیجیے کہ اس مقصد کی طرف جب بھی آپ اقدام کرنا چاہیں گے، بہرحال آپ کو ان مشکلات سے سابقہ پیش آئے گا۔ جو لوگ ان کا مقابلہ کرنے کی تدبیر اور عزم نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات ہی میں نہیں بلکہ کسی حال میں بھی اس طرف اقدام نہیں کر سکتے۔ اور جن لوگوں کے پاس تدبیر اور عزم دونوں موجود ہیں، اُن کے لیے کسی پھیر کے راستہ پر چلنا تضیعِ وقت اور حماقت ہے، وہ تو اس پہاڑ کو کاٹ کر براہِ راست ہی اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھائیں گے۔

پاکستانی خیال کے لوگ دوسرا گروہ زیادہ تر اُس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے۔ یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی مآخذ سے لیتے ہیں، مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب ان کے اندر موجود ہے، اور "مسلمان قوم" ہونے کا شعور ان کے اندر بیدار ہو گیا ہے اس لیے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں "مسلمان قوم" کے لیے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اقوال اور اعمال میں اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرز فکر و عمل عجیب طریقہ سے خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس خلطِ مبحث کا تجزیہ کر کے تفصیل کے ساتھ اس مخلوطہ کے ایک ایک جزء کی اصل و نوعیت کا نشان دے سکوں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے میں صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے گروہ کی طرح اس گروہ کا راستہ بھی راہِ راست کے تینوں اجزا سے منحرف ہے۔

(۱) پہلے دعوت کو لیجیے۔ ان کے ذمہ دار لیڈروں کی تقریریں، ان کی نمائندہ مجلسوں کی قرار دادیں، ان کے کارکنوں کی باتیں، ان کے اہلِ قلم کی تحریریں، سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کی دعوت اصل میں

ایک قوم پرستانہ دعوت ہے، یعنی ان کی نگاہ اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے بلکہ اس طرف ہے کہ ان کی قوم متفق و متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے اسی طرح انھوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنا لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اور "آزادی پسند" حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں، لیکن جس چیز نے اُن کی بہ نسبت ان کی روش کو اسلام کے لیے اور زیادہ مضر بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو وطن اور وطنی مفاد کے نام پر لڑتے ہیں، مگر یہ اپنی قومی اور دنیوی لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلمان کا نام لیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام خواہ مخواہ ایک فریقِ جنگ بن کر رہ گیا ہے اور غیر مسلم قومیں اس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اسلام کی دعوت کے لائق نہیں رکھا ہے، بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لیے مقفل پائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قوم پرستانہ دعوت کے ساتھ یہ لوگ کبھی کبھی اسلام کی خوبیاں اور اس کے اصولوں کی فضیلت بھی بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر اول تو قوم پرستی کے پس منظر میں یہ چیز ایک اصولی دعوت کے بجائے محض ایک قومی تفاخر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور مزید برآں دعوتِ اسلام کے ساتھ جن دوسری باتوں کی یہ آمیزش کرتے ہیں وہ بالکل اس دعوت کی ضد ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظامِ حکومت کی تبلیغ اور دوسری طرف اُن "مسلمان" ریاستوں اور حکومتوں کی حمایت جن کا نظام بالکل غیر اسلامی ہے، ایک طرف اسلامی نظامِ معاشی کی تشریح اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے قارونوں کی تائید و مدافعت، ایک طرف انسانی قانون سازی کا اصولی ابطال اور دوسری طرف خود قانون ساز مجالس میں اپنے حصہ کا مطالبہ، ایک طرف حاکمیتِ رب العالمین کا اقرار و اثبات اور دوسری طرف حاکمیت جمہور کے اصول پر خود اپنی قومی حکومت کے قیام کی فکر، ایک طرف انسانیت کی نسلی، قومی اور وطنی تقسیم کا ابطال اور دوسری طرف ہر وقت قوم قوم کا شور اور خود قومیت ہی کے اصولوں پر دوسری قوموں سے جدال و کشمکش، ایک طرف بے غرضانہ حق پرستی کا دعویٰ اور دوسری طرف شب و روز اپنے دنیوی مفاد کا نوحہ و ماتم، ایک طرف اسلامی تہذیب و تمدن پر فخر و ناز اور اس کی حفاظت کے لیے پُرشور لام بندی اور دوسری طرف اسی تہذیب و تمدن کے باغیوں اور

قاتلوں کی سرداری و پیشوائی، یہ دونوں چیزیں آخر کس طرح ایک ساتھ بھ سکتی ہیں؟ منکرے بود ن وہم رنگِ مستاں زیستن۔ ایسی متضاد باتوں سے دنیا نے کب اثر قبول کیا ہے کہ آج ان سے اسلام کا جھنڈا زمین میں گڑ جانے کی امید کی جاتی ہے؟

(۲) اب دیکھیے کہ یہ اپنی جماعتی تشکیل کس ڈھنگ پر کرتے ہیں۔ ان کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو جو ازروئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی جماعت کی رکنیت کا ٹکٹ دیتے ہیں اور جو اس کو قبول کرلے اُسے ابتدائی رکن بنا لیتے ہیں۔ پھر انہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمہ دار کارکن اور عہدہ دار منتخب ہوتے ہیں اور انہی کی کثرتِ رائے سے تمام معاملات انجام دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صرف قومی تنظیم ہی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اور اس طریقہ سے جو نظام بنے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک قوم کی خواہشات جیسی کچھ بھی ہوں اُن کے حصول کی کوشش کرے۔ رہی ایک اصولی تحریک، تو اس کو چلانے کے لیے یہ طریقِ جماعت سازی نہ صرف بے کار بلکہ مضر ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ اُن کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انھوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اُسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(۳) اس کے بعد اس طریقہ کا جائزہ لیجیے جس سے یہ بزعمِ خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ پہلے اُسی جمہوری دستور کے مطابق، جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی قومی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظامِ حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی "آزادیٔ ہند" کو مقدم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اُن کی تجویز پر مجھے

جو اعتراضات ہیں بعینہٖ وہی اعتراضات اِن کی تجویز پر بھی ہیں۔ اِن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیتِ رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی، بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ٹرکی اور مصر میں موجود ہے اور وہاں اس کو وہ "پاکستان" حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں مددگار ہے یا ہوتی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں کیا آپ وہاں حکومتِ الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلاوطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ اور جب صورتِ حال یہ ہے تو آپ کو غور کرنا چاہیے کہ آخر اسلامی انقلاب کے راستہ میں مسلمان قوموں کی ان آزاد حکومتوں کے سدِّراہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ اس معاملہ کی جتنی تحقیق آپ کریں گے جواب اِس کے سوا کچھ نہ پائیں گے کہ دراصل اصطلاحاً و نسلاً مسلمان ہونا اور چیز ہے، اور نظریۂ حیات و مقصدِ زندگی کا اسلامی ہونا بالکل ایک دوسری چیز۔ جو لوگ روح و اخلاق کے اعتبار سے

(حاشیہ صفحہ سابق) سلہ اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظِ دیگر ان کو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے، باقی رہا نظامِ حکومت تو وہ "پاکستان" میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا "ہندوستان" میں ہوگا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے، تو ذمہ دار لیڈروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا، البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صفِ آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت نہیں ہے انھوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تب ہم نظامِ حکومت بدلنے کی کوشش کریں گے۔

مسلم نہ ہوں بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں ان کو اگر بیرونی اثر و اقتدار سے کامل آزادی نصیب بھی ہو جائے، اور اگر اُن کے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو تب بھی حکومتِ الٰہی وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے دنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں، نہ صرف یہ کہ ان میں حق اور صداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس جب کبھی ان کی اغراضِ دنیوی سے حق و صداقت کا تصادم ہوتا ہے، وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اُس طرف جاتے ہیں جس طرف ان کی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ عام انتخاب میں ان کے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاجِ نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو تو اُس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہوکر برسرِ اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سندِ قبولیت حاصل کرسکیں گے۔

پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کرکے، اُن کے نقطۂ نظر کو تبدیل کرکے، اور اُن کے نفسیات میں انقلاب برپا کرکے ایک جمہوری نظام کو الٰہی حکومت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کرکے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے آپ یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ حکومت کا روپیہ، اس کے وسائل اور اس کے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انھیں حکومتِ الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کے بجائے اُلٹی اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر

عوام کے نفسیات میں تغیر واقع ہو گیا تو اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں اُن کا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں، اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور اُن کے نام اُن کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے۔ جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہوگی؟

تحریفِ دین کے مجوزین

اب تیسرے گروہ کو لیجیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی تجویزیں سوچ رہے ہیں۔ کوئی فکرِ اسلامی کے ساتھ غیر اسلامی افکار کا جوڑ لگا کر ایک نئی "خوشگوار" معجون بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس خیال میں ہے کہ "ہندوستانی اسلام" کا ایک نیا ایڈیشن نکالے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اس کے سیاسی و معاشی اصولوں کو لے لیا جائے اور ان کی بنیاد پر ایک ایسی جماعت بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے عقائد، عبادات اور احکامِ شرعیہ کی پابندی لازم نہ ہو۔ یہ سب لوگ اپنے نزدیک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان طریقوں سے رفتہ رفتہ وہ تنفر دور ہو جائے گا جو اسلام کے خلاف طبیعتوں میں پیدا ہو گیا ہے، اور جب وہ بعضِ اسلام سے کسی حد تک مانوس ہو جائیں گے تو پورے اسلام سے مانوس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ سب خیالات خام ہیں۔ نہ اصولی حیثیت سے ان کو صحیح کہا جا سکتا ہے اور نہ عملی حیثیت سے ہی ان کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرے نزدیک ایسی تمام تجویزیں ضعفِ دل اور ضعفِ دماغ کا نتیجہ ہیں۔

اصولی حیثیت سے درحقیقت ہم اسلام میں کسی رد و بدل، کسی کمی و بیشی، اور کسی ترمیم و تشکیلِ جدید کے مجاز ہی نہیں ہیں۔ ہم اسلام کے مالک نہیں ہیں، اس کے صانع نہیں ہیں، اس کے شارع نہیں ہیں۔ اسلام ہمارا مال نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جیسی طلب ہو اس کے مطابق اپنے اس مال کو بنا کر بازار میں لائیں۔ ہماری حیثیت صرف پیرو اور مبلغ کی ہے۔ مالک نے عقائد، عبادات اور احکام کا یہ پورا مجموعہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم خود اس کی پیروی کریں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ اس مجموعہ میں کوئی ترمیم کرنے کا، یا اس کی اصلی صورت کو بدل کر اس کی کوئی اور صورت بنانے کا ہم کو ہرگز کوئی حق نہیں پہنچتا جس کو

لینا ہے اسے پورے مجموعہ کو لینا پڑے گا اور اسی صورت میں لینا ہو گا جس میں مالک نے اسے دیا ہے۔ اور جو اس کو اس ہیئتِ مجموعی اور اس متعین صورت کے ساتھ نہ لینا چاہے اس کی خوشامد کرنے اور اسے کم و بیش پر راضی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام تو ایک حکم ہے خالق کی طرف سے مخلوق کی طرف۔ خالق کا کام مخلوق کی خوشامد کرنا اور اس کو راضی کرنا نہیں ہے۔ مخلوق کو یا تو اس کا حکم، جیسا کہ وہ ہے، جوں کا توں ماننا پڑے گا۔ ورنہ وہ خود اپنا ہی کچھ بگاڑے گی، خالق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے اس کے جو رسول دنیا میں آئے انھوں نے پورے حکم کو لوگوں کے سامنے بعینہٖ پیش کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ چاہو اس کو لو اور چاہو رد کر دو، بہر حال تمہاری خواہشات کے مطابق اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائے گا۔ ٹھیک یہی پوزیشن رسول کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی ہے۔

پھر یہ کتنی غیر معقول تجویز ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اس کے معاشی و سیاسی اصول کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجا آوری اور احکامِ شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ کیا کوئی صاحبِ نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحۂ عمل کو اس کے بنیادی فلسفے، اس کے نظامِ اخلاق اور اس کے تعمیرِ سیرت کرنے والے ارکان سے الگ کر کے چلایا جا سکتا ہے؟ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا سیاسی نظام آخر ہے کس چیز کا نام؟ اور اگر قرآن کو ماخذِ قانون اور محمد رسول اللہ کو رعیت (انسان) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان نزولِ احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے تو کیا اسلامی طرز کے اسٹیٹ کی تعمیر ہوا پر کی جائے گی؟ نیز وہ کونسا نظامِ تمدن و سیاست ہے جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا لیے بغیر قائم ہو سکتا ہے؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو آپ مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ مزید برآں وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے درکار ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں سکتا

ہے؟ پس یہ غایت درجہ کا افلاس فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حسن دیکھ کر کہنے لگے کہ آؤ جڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

عملی حیثیت سے بھی اس قسم کی تمام تجویزیں سراسر غلط ہیں۔ ان سے اصل مقصد تک پہنچنے کے بجائے خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہم خود ہی راستہ میں گُم نہ ہو جائیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جس نام نہاد اسلام کی تبلیغ کی جائے گی، ایک روز وہی اصل معیار بن جائے گا، اور جو لوگ اس پر ایمان لاکر جماعت میں شریک ہوں گے، نہ صرف وہ خود اصل اسلام کی طرف رجوع کرنے سے انکار کریں گے بلکہ وہ مصلحت پرست مسلمان بھی، جنھوں نے اُن سے کم و بیش پر سودا کیا تھا، ان کے ساتھ ان کی گمراہی میں شریک ہو جائیں گے۔ مدارات (Compromise) پر جو کام مبنی ہوتے ہیں ان میں ہمیشہ یہی خرابی ہوتی ہے۔

۶۔ مشکلات کا جائزہ

اب ہمیں ایک نظر ان مشکلات پر ڈالنی چاہیے جن سے خوف زدہ ہو کر یہ انحراف کی راہیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ کیا حقیقت میں وہ ایسی ہی مشکلات ہیں کہ ان کو حل نہیں کیا جا سکتا؟

تکرارِ بیان سے بچنے کے لئے میں ناظرین کو پھر ایک مرتبہ تکلیف دوں گا کہ پیچھے پلٹ کر مضمون کے اُس حصہ پر نگاہ ڈال لیں جہاں میں نے اِن مشکلات کی تشریح کی ہے۔

پہلی مشکل | پہلی مشکل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام صرف تمدنی، سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد، عبادات اور ضوابطِ شرعیہ کا ایک مجموعہ بھی اس کے ساتھ دیتا ہے، اور اس کو قبول کرنے کے معنی انسان کی پوری زندگی تبدیل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اسلام کو اس طرح پھیلنے نہیں دیتی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔

لیکن یہ مشکل بظاہر جتنی زبردست نظر آتی ہے، بباطن اتنی ہی کمزور اور بے حقیقت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کا مجرد حل پیش کرتا ہو اور اس کے ساتھ اپنے کچھ اعتقادات اور اپنا ایک مخصوص فلسفہ نہ رکھتا ہو۔ چند امور مابعد الطبیعت (Metaphysical problems) ایسے ہیں جن کے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک رائے قائم کرنا بہر حال

ہر اس مسلک کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک لائحہ زندگی بنانے کا عزم کرے۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کے لیے ہے مگر انسان خود کس کے لیے ہے، یہ دراصل انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جن کا ایک قابل عمل حل (Workable Solution) پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جا سکتا اور کسی نظام کے بعض محض عملی پہلوؤں کو نے کر آدمی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کے بنیادی فلسفہ، یا بالفاظ دیگر اس کے اعتقادات کو بھی قبول نہ کرے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس جہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک فی الواقع ایک مذہب ہی ہے اور جو بھی اس کی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر یہ کہتا اور سمجھتا رہے کہ بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک بڑی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کروں گا۔ یہ کمیونزم آپ کے سامنے ہے۔ اسی کو مثال میں لے لیجیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم اس کا وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے۔ اگر اسلام یہ پہلو لیتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ وحی کے ذریعہ سے آتی ہے تو کمیونزم یہ پہلو لیتا ہے کہ کوئی ہدایت درکار نہیں اور وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سلوک کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسان کو موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہے تو کمیونزم اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے، اور بعد میں نہ کوئی زندگی ہے نہ حساب نہ کتاب۔ دیکھیے یہ دونوں یکساں مابعد الطبیعی نظریے ہیں اور دونوں میں

سے کسی کو بھی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اب اگر کسی سائنٹیفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور قطعی تنہا دلائل کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقطۂ نظر کو قبول کر سکتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ آخر انھی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطۂ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمد رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اس کو اپنا رہنما تسلیم کر سکتا ہے تو آخر کونسی چیز مانع ہے کہ ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمد رسول اللہ کی زندگی، ان کی تعلیمات اور ان کے کارنامے کو دیکھ کر ان کو اپنا ہادی و رہبر تسلیم نہ کر لے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط (Party-discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام اُن لوگوں کو جو اس کی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی ان لوگوں کو جو اس میں شامل ہوں کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت سے انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہوّا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں گے اُن کو یہ ہوّا اپنی صورت دکھا کر بھگا دے گا؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اس کی توحید کا اعتقاد یا آخرت کا اعتقاد یا پیغمبر کی ناقابلِ منازعت پیشوائی Indisputable Leadership اور قرآن کے آخری منبع قانون ہونے کا اعتقاد شرط لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اس کی طرف کھنچ کر آنے میں سدِ راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسلکوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان ان مسلکوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پاتے ہیں وہ ان کے عقائد اور ضوابط دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر اسلام اُن کے سامنے تمام مسائل زندگی کا بہترین حل پیش کرے، اور ان کی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی شرط صرف

اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے غیر معمولی رکاوٹ ثابت ہو۔ رکاوٹ اگر ہے تو فی الواقع صرف اسی حد تک ہے کہ لوگوں کے لیے بالعموم اپنے پُرانے مسلک کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو تحریک بھی دنیا میں پھیلتی ہے اسے بہر حال اس رکاوٹ سے سابقہ پیش آتا ہی ہے اور جو لوگ کسی تحریک پر ایمان لاتے ہیں وہ بہر حال اس رکاوٹ کو عبور کر کے ہی آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اس کو سامنے کھڑا دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش صرف وہی شخص کرے گا جو یا تو اپنے ایمان ہی میں صادق نہیں ہے یا پست ہمت اور ناکارداں ہے۔

البتہ اسلام کے حق میں اس رکاوٹ کو جس چیز نے شدید تر رکاوٹ بنا دیا ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔

اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (RELIGION) کے مزعومات بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع اور نظامِ تمدن کی منطقی بنیادیں ہیں۔ اور اسی طرح اس کی عبادات محض پوجا اور تپسیا بنا کر رکھدی گئی ہیں حالانکہ وہ اُن ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظامِ اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحۂ عمل کو چلانے کے لیے اِن عقائد اور عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔

دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گذشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہارِ قدر شناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔

تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعین، اور روح سے بڑھ کر ظا

پر مدار دین داری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا کرے گی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا باعث بن رہی ہے۔ اس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں؟

اسلام کے راستہ میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر یہ اسلام کا قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے اس نظامِ تعلیم کو بدلیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زندہ تحریک علمی عقائد کے بل پر تو نہیں اُٹھ سکتی۔ ہمیں اس کے عقائد کو معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہو گا، پھر عقائد کے ساتھ عبادات کا اور عبادات کے ساتھ زندگی کے قوانین کا منطقی ربط واضح کرنا پڑے گا، پھر ان قوانین کو زندگی کے تمام عملی مسائل پر منطبق کر کے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ جتنی انسانی ضروریات ہیں ان سب کا حل اِن قوانین میں موجود ہے تب کہیں لوگ اس نظام کو ایک معقول نظام کی حیثیت سے سمجھ سکیں گے، اور جب وہ اُسے سمجھیں گے تو قبول بھی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ تعمیری کام چونکہ محنت طلب ہے اس لیے اس محنت سے جی چرا کر لوگ بنے بنائے آسان راستوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے راستہ بنانے کی زحمت بہر حال ہمیں اٹھانی ہی پڑے گی۔ جس نے بھی کوئی مقصدِ عظیم پیشِ نظر رکھا ہے اُسے یہ زحمت اُٹھانی پڑی ہے، اور اگر واقعی ہم اپنے مقصد میں صادق ہیں تو ہمیں اس کام کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

دوسری مشکل اب دوسری مشکل کو لیجیے۔ جن تعصبات کو اسلام کی راہ میں حائل بنایا جاتا ہے اُن کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

ایک قسم کا تعصب تو وہ ہے جو طبعاً ہر شخص کے اندر اس چیز کے خلاف ہوتا ہے جو اس کے لیے نئی ہو، جس پر اُس نے اپنے باپ دادا کو نہ پایا ہو، اور جس سے وہ مانوس نہ ہو۔ یہ تعصب صرف آج ہی اسلام کی راہ میں حائل نہیں ہے، پہلے بھی حائل تھا۔ اور جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، یہ صرف اسلام ہی کی راہ میں حائل نہیں ہے، ہر تحریک کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسی رکاوٹ نہیں ہے جس کو دور نہ کیا جا سکتا ہو۔ پہلے بھی اس رکاوٹ کے باوجود اسلام پھیلا ہے

اور اب بھی پھیل سکتا ہے۔

دوسری قسم کا تعصب وہ ہے جو دراصل اسلام کے خلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کے واسطہ سے اسلام کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں میں جو غیر اسلامی طریقے اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں اختیار کیے اور اب بھی اپنے انفرادی کردار اور اجتماعی رویے میں جس غیر اسلامی سیرت کا وہ اظہار کر رہے ہیں، یہ سارے تعصبات فی الحقیقت اُسی کے بھڑکائے ہوئے ہیں۔

اس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اسلامی حکومت، خالص اسلامی اخلاق اور حقیقی اسلامی تمدن سے لذت آشنا ہونے کا کبھی موقع ملا ہی نہیں۔ گذشتہ زمانہ میں مسلمان بادشاہوں نے، مسلمان امراء نے، مسلمان حکام اور اہل کاروں اور سپاہیوں نے، مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے اور مسلمان عوام نے اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش اُن کے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدتہائے دراز تک برپا ہوتی رہی اس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے۔

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی طریق کار سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونہ کو دیکھ کر لوگ اس تحریک کے عاشق ہو جائیں جس کی نمائندگی اس شان سے کی جا رہی ہو۔ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اُس برتری کے منبع کی جستجو کریں؟ اس کے برتاؤ میں، اس کے اخلاق میں، اس کے معاملات میں کہاں کوئی خفیف سی جھلک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص خالص تر اور پاکیزہ تر اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا ایک مسلمان زمیندار یا "شریف" اصطلاحی "کمینوں" کے مقابلہ میں اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم "شریف" یا رئیس سے کچھ کم نخوت برتتا ہے؟ کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا عہدیدار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم ہمسر سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا

ہے؟ کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذلیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جن کی پیروی اُن کے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور انہی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے پیچھے لڑ لڑ مرنا، جس کی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے ان نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی فوقیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انھیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور جب وہ انھیں بھی انہی مقاصد کے لیے لڑتے جھگڑتے اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جن کے لیے وہ خود لڑتا جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کونسی چیز اُس کو اُس مسلک کی طرف مائل کر سکتی ہے جس کی نمائندگی یہ لوگ کر رہے ہیں؟ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات، اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اس کے دل کے دروازوں پر قفل چڑھانے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر، قومی دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر مُصر ہیں، بلکہ جسے اپنی حیاتِ اجتماعی کا ضامن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصولِ اسلام اور مقاصدِ اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر، کسی ریزولیوشن میں آپ ایک فقرہ تک ایسا نہیں پا سکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر کلی اصولوں کے کر اُٹھے ہیں اور ان کی لڑائی محض اصولِ حق کی خاطر ہے۔ اس کے برعکس آپ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر اترآئے ہیں، ایک ہی مرتبہ کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (Tactics)، زبان، اصطلاحات اور اصولِ نزاع اختیار کر رہے ہیں، اور سارا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے ہے جنکے لیے ان کے حریفوں کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے آپ دنیوی اغراض کے لیے مساویانہ برابر لڑ رہے ہوں جن سے آپ رقابت و حریفی کا پرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں، جن کے ساتھ آپ کی سیاسی اور معاشی مفاد کے لیے

کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیموکریسی یا کسی اور مسلک کی دعوت کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

یہ تعصبات اسلام کے راستے میں دوسری عظیم الشان رکاوٹ ہیں، مگر ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم ان تعصبات کی پیدائش کے سبب کو باقی رکھیں اور پھر ان کی موجودگی کو بہانہ بنا کر اپنے مقصد کی طرف براہ راست پیش قدمی کرنے سے منہ موڑیں، بلکہ ان کا اصلی علاج یہ ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی طرز عمل کو بدلیں اور اس طرح تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے سیدھا راستہ تیار کریں۔ جو لوگ محض سرسری نگاہ میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کے خلاف ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اس حالت میں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں پھیل سکتا، وہ دراصل واقعات کو غلط رنگ میں دیکھتے اور غلط نتائج نکالتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ثابت کیا ہے، یہ تعصبات اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہیں (جس سے ان قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے) بلکہ اسلام کے اُن غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصۃً للہ کام کرنے کے بجائے اپنی دنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔ لہٰذا ان تعصبات کے تدارک کی صحیح صورت یہ ہے کہ اب اپنی سیرت، اپنے اعمال، اور اپنی اجتماعی جدوجہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنائیے جس کی وجہ سے تعصبات پیدا ہوئے ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دنیوی مفاد کے لیے جو کشمکش آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور ان کے قوم پرستانہ طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں، کیا اس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی دور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرمائیے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہیں گے اور اگر اسلام آپ ہی کا ورثہ

آبائی بنا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی طرح محض آپ کا قومی مذہب بن کر رہے گا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکے گا۔

یہ انسانی فطرت کا اقتضاء ہے کہ خود غرضی کے جواب میں خود غرضی اور قوم پرستی کے جواب میں قوم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے بے غرضانہ حق پرستی کے مقابلہ میں تمام تعصبات اور تمام مخالفانہ جذبات آخرکار ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ایک سچے بے لوث حق پرست کے آگے انسان عقیدت و محبت کے سوا کوئی اور چیز پیش کرنے پر قادر ہی نہیں رہتا۔ اگر مسلمان اپنی وہی حیثیت قائم رکھتے جو دراصل ان کی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان میں ان کے خلاف وہ تعصبات پائے جاتے جن کی آج شکایت کی جاتی ہے۔ لیکن انھوں نے خود اپنی وہ حیثیت کھو دی۔ دنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے لڑنے جھگڑنے لگے، اور اصولِ حق کے بجائے اپنی اغراضِ ذاتی و قومی کو انھوں نے اپنی جد و جہد کا محور بنا لیا۔ اس کے جواب میں اگر دوسروں کے اندر تعصب نہ پیدا ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔ جن اصولوں کا آپ نام لیتے ہیں ان کی آپ خود پیروی نہیں کرتے بلکہ رات دن اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں اُن کے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔ جس مقصدِ عالی کا آپ اظہار کرتے ہیں، آپ کی عملی جد و جہد اُس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ آپ کے افراد انفرادی طور پر اور آپ کی پوری جماعت بحیثیتِ مجموعی اس کو پس پشت ڈال کر دوسرے مقاصد کے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر اپنے خیالی نصب العین اور اپنے محض زبانی اصولوں کے لیے آپ کا اپیل دوسروں پر کارگر نہ ہو، اگر وہ اس اپیل میں آپ کو جھوٹا سمجھیں اور آپ کی تبلیغ کو محض خود غرضانہ چال سمجھ کر حقارت سے رد کر دیں، تو آخر اس میں حیرت کی بات ہی کونسی ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم مسٹر جناح کے ۱۴ یا ۲۴ نکات پر تو ایمان نہیں لا سکتا۔ نہ مسلم لیگ یا مجلسِ احرار یا جمعیت العلما کے ریزولیوشنوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان لائے۔ ایمان اگر کوئی لا سکتا ہے تو لا الٰہ الا اللہ پر لا سکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت اسی کلمہ کے لیے جینے اور اسی پر مرنے والی اس کے سامنے موجود ہو۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کونسی جماعت آپ کے اندر ایسی موجود ہے جس نے خالص اطاعتِ حق کو اپنا مسلک اور خالص دینِ حق کے قیام کو اپنی کوشش کا مرکز و محور بنا لیا ہو؟ لوگ اسلام کی دعوت اور اُس کے اصولِ حق کو کتابوں میں دیکھتے ہیں اور ان کے معترف ہو جانے

ہیں۔ مگر اس اسلام پر عمل کرنے والی اور اس کے نصب العین کے لیے کام کرنے والی سوسائٹی ان کو کہیں نہیں ملتی۔ پھر وہ جائیں تو آخر کہاں جائیں؟ کیا اس سوسائٹی میں شامل ہوں جو رات دن دنیا ہی کے پیچھے مری جاتی ہے اور انہی راستوں پر چلی جا رہی ہے جن پر غیر مسلم چلتے ہیں؟ آپ کی ایک جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ارض ہند پر انگریز کے بجائے ہندوستانی کا اقتدار قائم ہو۔ بعینہٖ یہی چیز ایک شخص کو غیر مسلم جماعتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ پھر وہ آپ کے پاس کیوں آئے؟ آپ کی دوسری جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ہندو کے مقابلہ میں نسلی مسلمانوں کے دنیوی مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ یہ چیز اس کو خود اپنی قوم پرستی کی مدمقابل نظر آتی ہے۔ پھر وہ اپنی قوم پرستی کو چھوڑ کر آپ کی قوم پرستی پر کیوں ایمان لائے؟ انسان کو غیر اللہ کے تسلط سے آزاد کرنے والی جماعت آپ میں ہے کہاں کہ کوئی اس کے اصول و مقاصد پر ایمان لائے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھے!

تیسری مشکل سب سے بڑی گتھی جو ہمارے سوچنے والے دماغوں کے لیے ناقابل حل بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کروڑوں کی تعداد میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو نہ پوری مسلمان ہے نہ پوری غیر مسلم۔ اس قوم کے اس حال میں یہاں موجود ہونے سے متعدد پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا کوئی حل لوگوں کو نہیں ملتا اور اسی وجہ سے رہنما اور کارکن سب پراگندہ عمل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں اُن چند بڑی بڑی الجھنوں کی طرف اشارہ کروں گا جو اس صورت حال نے پیدا کر دی ہیں۔

بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پائی جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور بر سر عروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیاء ہے۔ یہ غلط فہمی اُن کو "مسلم قوم پرستی" کی حد تک کھینچ لے گئی ہے۔ جس طرح مونجے اور ساورکر کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے، جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح ان "مسلم قوم پرستوں" کے لیے اصل سوال اُس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اور جس کے ساتھ ان کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم (قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم کیسی ہی ہو)، ان کی معاشی خوش حالی (خواہ وہ کسی قسم کے ذرائع سے حاصل ہو) اور اُن کی

سیاسی و عسکری تنظیم (مجرد قومی تنظیم) پر اپنا زور صرف کیا جائے، اور اُن کو ایک زبردست قوم بنا دیا جائے۔ پھر جب یہ اِن کا مقصد قرار پایا تو انھوں نے معاملات کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کونسی تدابیر اس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہیں، اور جو تدبیریں بھی اِن کو دنیا میں قومی عروج کے لیے مفید و کارگر نظر آئیں اُن کو بے تکلف انھوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا خواہ وہ اسلام سے اُن کو کتنی ہی دور لے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سر سید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے۔

کچھ دوسرے لوگ اسلام اور مسلمان کو اس حیثیت سے تو خلط ملط نہیں کرتے، لیکن ایک دوسری حیثیت سے وہ اسلام کے مستقبل کو موجودہ نسلی مسلمانوں کے دامن سے باندھ دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تو اسلام ہی کا احیاء ہیں، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کا احیاء موقوف ہے اُن سب مسلمانوں کے مکمل مسلمان بن جانے پر جو اس وقت قومی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ سارے کے سارے مسلمان ذہنی، اخلاقی اور عملی حیثیت سے تبدیل نہ ہو جائیں قدم آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اور یہ چیز چونکہ سخت دشوار بلکہ محال نظر آتی ہے، اس لیے یہ لوگ اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کے فضول کاموں میں مختلف ضمنی مقاصد کے پیچھے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کے سامنے اسلامی نصب العین قریب قریب بالکل واضح ہو چکا ہے اور وہ اس کی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں، مگر یہ سوال اُن کو بار بار پریشان کرتا ہے کہ اگر ہمارے کارفرما دماغ اور کارکن ہاتھ سب کے سب اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے میں لگ جائیں تو آخر موجودہ کافرانہ نظامِ تمدن و سیاست اور اُس کے آئندہ تغیرات میں ہماری قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کا کیا حشر ہو گا۔ اس سوال کی اہمیت ان کی نگاہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے عزم سفر کو ملتوی کر کے کہتے ہیں کہ پہلے اس سوال کو حل کیا جائے اور اصل مقصد کی طرف قدم اس وقت بڑھایا جائے جب اپنی قوم کا کوئی مسئلہ ہمارے لیے حل طلب باقی نہ رہے۔

لیکن یہ تمام اُلجھنیں غیر اسلامی طرزِ فکر اور غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اگر خالص مسلمان ہونے کی حیثیت سے

دیکھا جائے تو اِن میں سے کوئی اُلجھن بھی ہمارے لیے اُلجھن نہیں رہتی۔ ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیار کا نہیں بلکہ مسلکِ اسلام کے احیار کا ہے۔ قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کافور کی طرح اُڑ جاتے ہیں جو قومیت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔ جب ہم مسلکِ اسلام کے پیرو ہیں اور اس کو فروغ دینا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں کسی ایسے مفاد سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہو سکتی جو کسی غیر اسلامی نظام سے وابستہ ہو یا اصولِ اسلام سے متصادم ہو۔ ہم اپنے دماغ کو اس کے لیے سوچنے کی کچھ بھی زحمت نہ دیں گے۔ قومی احیار کی اُن تمام تدبیروں سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہوگا جو غیر اسلامی اصول پر مبنی ہوں۔ ایک قوم اور دوسری قوم کی باہمی کشمکش، اور ایک قوم پر دوسری قوم کے تفوق کی کوششوں سے بھی ہم پوری تبرّی کریں گے۔ ہم کو جو کچھ بھی دلچسپی ہوگی اسلامی نظامِ فکر و عمل سے، اس کی تبلیغ و اشاعت سے اور اس کو حکمراں بنانے کی سعی و جہد سے ہوگی۔ مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف اسی حد تک ہوگا جس حد تک ان کا تعلق اسلام سے ہے۔ جو اپنی خواہشِ نفس اور ہر غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی میں آجائے وہ ہمارا بھائی اور ہمارا رفیق ہے، خواہ وہ نسلی مسلمانوں میں سے آئے یا غیر مسلموں میں سے۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی اسی مسلک کی طرف دعوت دیں گے اور پیدائشی غیر مسلموں کو بھی۔ ہمارے نزدیک اسلام کا دامن نسلی مسلمانوں کے دامن سے بندھا ہوا نہ ہوگا کہ یہ اُٹھیں تو وہ بھی اُٹھے اور یہ نہ اُٹھیں تو وہ بھی نہ اُٹھے۔ اسلام اِن کے باپ دادا کی جائیداد نہیں ہے۔ یہ اُس کے لیے جینے اور اُسی کے لیے مرنے پر تیار ہوں تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ورنہ جس جہنم میں ان کا جی چاہے جا کر گر جائیں۔ ہم اللہ کا کلمہ دوسرے انسانوں کے پاس لے جائیں گے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں بعینہٖ یہی طرزِ عمل انبیاء و رسل کا تھا اور اسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ قرآن میں جن کو اہلِ کتاب کہا گیا ہے وہ آخر نسلی مسلمان ہی تو تھے۔ خدا اور ملائکہ اور نبی اور کتاب اور آخرت سب کو مانتے تھے، اور عبادات اور احکام کی رسمی پیروی بھی کرتے تھے۔ البتہ اسلام کی اصل روح، یعنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دینا اور دین میں شرک نہ کرنا، یہ چیز ان میں سے نکل گئی تھی۔ اب دیکھیے، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس نسلی مسلمان قوم کے احیاء کی کوششوں کو مرکز بنایا تھا؟ نہیں۔ کیا آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک یہ سارے کے سارے

"نسلی مسلمان" اصلی مسلمان نہ بن جائیں گے قدم آگے نہ بڑھایا جائے گا؟ یہ بھی نہیں۔ کیا آپ نے ان "نسلی مسلمانوں" کے دنیوی مسائل کو حل کرنے تک اقامتِ دین کی کوششوں کو ملتوی رکھا تھا؟ یہ بھی نہیں۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ نے تمام معاملات اور تمام مسائل سے قطع نظر کرکے "نسلی مسلمانوں" اور غیر مسلموں، سب کو خالص اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی، جس نے اسے قبول کیا اور غیر اللہ کی بندگی و اطاعت ترک کر دی اُسے اپنے جتھے میں شامل کرلیا اور پھر ان لوگوں کو لے کر الٰہی نظامِ اطاعت یعنی دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے براہِ راست جدوجہد شروع کر دی یہاں تک کہ اس کو قائم کر کے چھوڑا۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جس کی پیروی کو میں حق سمجھتا ہوں، اسی کی پیروی خود کرنا چاہتا ہوں، اور اسی کا مشورہ ان سب لوگوں کو دیتا ہوں جن کا نصب العین اسلامی ہے۔

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

اس مقالہ میں مجھے اس عمل (Process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف حلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی Loose-thinking کی تمامتر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو، مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے، اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ قائم کیونکر ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریقہ پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظامِ حکومت کا طبعی ارتقاء

جو لوگ اجتماعیات میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو، مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر اُدھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Pre-requisites)، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے، جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ

ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائٹی میں بہم ہوگئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اس کی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور اُن کی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور اُن کو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پاکر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، اُن کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما کے لیے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گزر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہی اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر دراصل میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظامِ حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہرحال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اُٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں، اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے، اسی طرز کی لیڈرشپ ہو اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضاء اُس خاص نظامِ حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد کرنے سے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظامِ حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظامِ حکومت اُبھر آتا ہے جس کے لیے ان طاقتور اسباب نے جدوجہد کی ہو۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اس کی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈرشپ، انفرادی سیرت، جماعتی اخلاق، اور حکمتِ عملی ہر ایک

چیز ایک نوعیت کا نظام حکومت پیدا کرنے کے لیے موزوں و مناسب ہو، اور امید یہ کی جائے کہ اُن کے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہو گا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور خام کاری کے سوا کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں اُس کی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرد ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں میں اس کو (Ideological State) کہوں گا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں یا طبقوں کی حکومت سے واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اُصولی حکومت، اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرلے وہ بلا لحاظ قومیت اسٹیٹ کو چلانے میں حصہ دار ہو گا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ عیسائیت نے اس تخیل کا بہت ہی دُھندلا سا نقش پایا، مگر اس کو وہ مکمل نظام فکر نہ مل سکا جس کی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔ انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہو گئی۔ اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اس کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اس کی رگ و پے میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کر کے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کر کے غیر قومی حکومت بنائیں۔ یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گردو پیش کی تمام دنیا اس کے خلاف چل رہی ہے اس لیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اس کو اور اس کے جملہ تضمنات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں مگر جن کے اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علوم عمران (Social Sciences) سے بنے ہیں، اُن کے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ بیرونِ ہند کے وہ مما لک

جن کی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمامِ حکومت آئی تو اُن کو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت (National State) کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلام کے علم وشعور اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی مشکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بیچارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر پھر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرزِ فکر (Natio listic Ideology) ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ اُن کے نزدیک پیشِ نظر مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ "مسلمان" کے نام سے جو ایک "قوم" بن گئی ہے اُس کے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اس کو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں، اس کے سوا کوئی طریق کا انھیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزاء سے یہ قوم مرکب ہے اُن کو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، اُن میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے، اُن کے اندر مرکزی اقتدار ہو، اُن کے نیشنل گارڈس منظم ہوں، ان کی ایک قومی ملیشیا تیار ہو، وہ جہاں اکثریت میں ہوں وہاں اقتدارِ اکثریت (Majority-rule) کے مسلّم جمہوری اصول پر ان کے قومی اسٹیٹ بن جائیں، اور جہاں اُن کی تعداد کم ہو وہاں اُن کے "حقوق" کا تحفظ ہو جائے، ان کی انفرادیت اُسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں ہر قومی اقلیت (National Minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی و انتخابی ادارات میں ان کا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وغیر ذٰلک من القومیات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت، ملت، ملیت، امیر، اطاعتِ امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لے کر بولتے ہیں، مگر اساسی فکر کے اعتبار سے یہ سب اُن کے لیے مذہبِ قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے اور غیر اسلامی رنگ کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے۔

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئے گی کہ اس کی بنا رکھنے کے لیے یہ طرزِ فکر، یہ اندازِ تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جز، ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اصولی حکومت کے تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں۔ ہم ان کے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اسی پر تمدن کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں ان کی فلاح ہے اور جو اس کو قبول کرے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اس تخیل کو لے کر وہ شخص کس طرح اُٹھ سکتا ہے جس کے دماغ، زبان، افعال و حرکات، ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپّا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنے کا دروازہ خود ہی بند کر دیا، پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کر کے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جن کے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد ہی قوم پرستی اور قومی ریاستیں ہیں، ان کو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور اپنے قومی اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح آپ کی عقل یہ بات قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں کو روکنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

خلافتِ الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصوّر پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ[1] یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے، وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے: یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستور

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا رسالہ "اسلام کا نظریہ سیاسی"۔

حکومت آیا ہو، یا وہ اس شخص کی پیروی اختیار کرے جس کے پاس خدا کی طرف سے "قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہوں گے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اس کی پیروی کرنے پر تیار رہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائے گا کہ ہم سب بہ حیثیتِ مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اُس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جس کے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جس کی گرفت سے ہم مر کر بھی نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، ان کو اپنا غلام بنائیں، اُن کے سر اپنے آگے جھکوائیں، اُن سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ سارا بار ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی نفس پرستی تعصب، جانبداری یا بددیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائیں گے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اُٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی ترکیب، اس کا مزاج، اس کی فطرت، کوئی چیز بھی اُن سے نہیں ملتی۔ اُس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُس کی فوج، اس کی پولیس، اُس کی عدالت، اُس کے مالیات، اُس کے قوانین، اُس کے محاصل، اُس کی انتظامی پالیسی، اُس کی خارجی سیاست، اُس کی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ ان کی عدالتوں کے جج اور چیف جسٹس اس کی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ان کی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھیرتے۔ ان کے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ ان کے وزرائے خارجہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہوں گے، شاید اپنے جھوٹ، دغا اور بددیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو ان حکومتوں کے

کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جن کی اخلاقی و ذہنی تربیت ان کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں۔ اُس کو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفرا اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال میں اُس ضابطہ اور اس طرز عمل کے پابند ہوں جو اُن کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے، جن کی تمام سعی و جہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشہ میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے اُن کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکّے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت اُن کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارتگری، ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو بلکہ اُن کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جن کی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ اُن کی راستی، انصاف پسندی، اصولِ اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے۔ اور یہی لوگ اس کو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (Utilitarian Mentality) رکھنے والے لوگ جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جن کے پیش نظر نہ خدا ہو نہ آخرت، بلکہ جن کی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہوں گے، اُن کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت

میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی کیا سبیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائیٹی میں جس قسم کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں، ان کے تفاعل سے اُسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لے کر پورا درخت بننے تک تو نیموں کی حیثیت سے نشوونما پائے، مگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ در حقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اُٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات، وہ مقصدِ زندگی، وہ معیارِ اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائیٹی میں اُسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرینِ مالیات و معاشیات، مسلم ماہرینِ قانون، مسلم ماہرینِ سیاست، غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمۂ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual Leadership) کا سکہ جما دیں[1]۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اُٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر پرکھنے والا ہر طرح سے جانچ کر بے کھوٹ

---

[1] ملاحظہ ہو میرا رسالہ "نیا نظامِ تعلیم"

کامل العیار سونا ہی پائے۔ اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اُس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اُٹھے ہیں۔ اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راستباز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اُس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئیں گے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اُس کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظامِ حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی، اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخرکار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظامِ حکومت قائم ہو جائے گا جس کے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہو، اور جونہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اُس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہل کاروں سے لے کر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پُرزے اس نظامِ تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے جس کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔

یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اسی نوعیت کی تحریک، اُسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن اور اُسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلابِ فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مونٹسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلابِ روس صرف مارکس کے افکار اور لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ اور اُن ہزارہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جن کی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اُس مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جو ہیگل، فشتے، گیوٹے، نیٹشے، اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈرشپ نے تیار کیا۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جب کہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات

وتصورات اور محمدی سیرت وکردار کی بنیاد پر اُٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقتور جد وجہد سے بدل ڈالے۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک جس کا پس منظر یہ ناقص نظامِ تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جس کی بنیاد افادی اخلاقیات Utilitarian morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا کر سکتی ہے؟ میں اُس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیرِ اعظم موسیو رینو یقین رکھتے تھے[1]۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائے گی ویسے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے۔ "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن در اصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جد وجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریقِ کار اختیار کرے گی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن، یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع ومحل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ وہ موہنجے یا ساورکر ہو یا ہٹلر یا مسولینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر۔ پس اگر "مسلمان" ایک نسلی وتاریخی قومیت کا نام ہے اور پیشِ نظر مقصد صرف اس کا بول بالا کرنا ہے تو اس کے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آ سکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی

---

[1] موجودہ جنگ میں فرانس کی شکست سے چند روز پہلے موسیو رینو نے، جو اُس وقت وزیرِ اعظم تھے، ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب فرانس کو صرف ایک معجزہ ہی بچا سکتا ہے اور میں معجزات کا قائل ہوں"۔

انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ اُلٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت خدا کے خوف سے اُتنا ہی خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے اُن کو لومڑی کی ہشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے اُن میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کرنا جنگل کی فرماں روائی حاصل کرنے کے لیے تو مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلاءِ کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون اُن کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا؟ کس کی نگاہیں اُن کے سامنے عزت سے جھکیں گی؟ کس کے دل میں انھیں دیکھ کر اسلام کے لیے جذبۂ احترام پیدا ہوگا؟ کہاں اُن کے "انفاسِ قدسیہ" سے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکے گا؟ کس جگہ ان کی روحانی امامت کا سکہ جمے گا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں اُن کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کریں گے؟ اعلائے کلمۃ الحق جس چیز کا نام ہے اُس کے لیے تو صرف اُن کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پروا کیے بغیر جمنے والے ہوں، خواہ وہ اس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ انبوہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں ۲۵ لاکھ یا ۵۰ لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تانبے کے اُن سکّوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپّہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکّہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکہ اُن

جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے ـــــ پھر جس لیڈر شپ کی اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے وہ ایسی لیڈر شپ ہے جو اُن اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جن کا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اُٹھا ہے، خواہ اس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مرجائیں بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اُس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی فلاح نظر آئے، اختیار کر لینے والی لیڈر شپ اور وہ لیڈر شپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو، اُس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظامِ تعلیم و تربیت جس کی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"، اُس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابلِ ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو، تم بہرحال اُس راستہ پر چلو جو خدا نے تمھارے لیے معین کر دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپ کو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر اُس کا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکیں گے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مالگذاری، فینانس، تعلیمات، اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے اُن کو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے۔ یہ تعلیم جو آپ کے کالجوں میں دی جارہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکریٹری اور وزراء تک فراہم کر سکتی ہے، مگر بُرا نہ مانیے، اسلامی عدالت کے لیے چپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹبل تک فراہم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات جدید تعلیم ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا وہ پُرانا نظامِ تعلیم جو حرکتِ زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیرِ مال، ایک وزیرِ جنگ، ایک ناظمِ تعلیمات اور ایک سفیر بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ! سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں اُن کے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے،

پھر رفتہ رفتہ تعلیم وتربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے، جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ عمر ابن عبد العزیز جیسا فرماں روا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظام حکومت میں نہیں صرف اس کی اوپری شکل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر قائم ہو گا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیرکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا لیبل لگا ہو گا۔ انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہو گی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ

"مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلا وطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی امداد کے بغیر، بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہِ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِّ راہ ثابت ہوگی؟

اسلامی تحریک کا مخصوص طریقِ کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور ازسرِنو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریقِ کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے لیڈر وہ لوگ تھے جن کو رُسُل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اس کے سوا کوئی اور طرزِ عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سُراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گذرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائبل کے عہدِ جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی

تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔[1] اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے اسی طرف رجوع کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظم مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہٰذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے، ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا اور اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی، اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے، عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انھوں نے عربوں کو اپنی سود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اُس کے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے

[1] چونکہ مسیح علیہ السلام کا طریق تعلیم و تربیت بھی اس تحریک کے ابتدائی مرحلے کو سمجھنے کے لیے مفید ہے، اس لیے تفہیمات [illegible]

اور خود اپنے ملک کے اِن بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ دعوت اِس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اُسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کرکے حل کیا۔ مگر ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار Independent اور غیر ذمہ دار (Irresponsible) سمجھنا، بالفاظِ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحبِ امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رو سے کوئی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائے گا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے ہٹائے سے ہٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اِس اٹل اور اَمرِ واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیری ہی اوپر عائد ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اس کے حکم کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بن کر رہ۔ دوسری طرف اس واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختارِ کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اس لیے تو اُس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن۔ کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔

یہاں کوئی ہز ہائینس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف ایک ہی کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈشپ نہیں ہے۔ لارڈشپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law giver) نہیں ہے۔ قانون اُسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار وسزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی ولی وکارساز، کوئی دعائیں سننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری وفوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کردے اور اسی ایک کا غلام، مطیع اور پابندِ حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سرِ نو ایک نئے نقشے پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقہ سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کردیا۔ انھوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کرکے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے پھر اس اثر سے کام لے کر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک لے آئیں، یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا، اور چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کردیا۔ اس سے کم کسی چیز پر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی نظر نہ ٹھیری۔ اس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ واقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہیں وہ اس بنیاد پر تعمیرِ جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں

جو آپ کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں ان کے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں۔ لہٰذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبر اور حکمتِ عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوتِ توحید سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کو خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت والوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے موذن کو اشہدان لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہے اور نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرماں روا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب کا باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی

تھی وہ اس کو دبانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق Racial Superiority کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بُت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا، اس لیے الکفر ملة واحدة، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست، آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کچے کیرکٹر اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسل آدم کا بہترین جوہر تھا جس کی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گذر کر آئے۔ پھر جو لوگ آئے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اس کی رضا کے لیے۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے بھوکے مرے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی

ذہنیت پیدا ہوتی گئی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیتِ اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اُٹھتا ہے اور اس کی راہ میں کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گذرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اس کی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر ان کی نگاہ جمی رہے۔ جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جائیں جس کے حکم کے مطابق انھیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادہ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں بھی اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک ان کے دل میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں۔ تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انھیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو ان کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اُس چیز کو معلوم کریں، آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انھیں معلوم ہوتا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں تو ان کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اُن کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے

تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جاکر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبر، یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند، بے لوث آدمی کو اس کی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہر بات، ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

ان کی بیوی حضرت خدیجہ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا، اس کو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے، عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دیں گے، دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اُس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد! ہم تمھارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمھاری باتیں کیسے سنیں جبکہ

تمھاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقے کے لوگ ہیں اُن کو تم نے اپنے گرد وپیش جمع کر رکھا ہے۔ انھیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلہ، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان، بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اُٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچالوں تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اُٹھتے تو حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ در اصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکہ سے جب آپ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں حضرت علیؓ کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لے کر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انھیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اس وقت کی جبکہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال بعد بدر کے میدان میں آنحضرت کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہوں گے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُس وقت ان کے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہوں گے مگر اُن کے دل اندر سے بیچ رہے ہوں گے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پاکر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اُسے کام کرنے کا موقع ملے، مسلمان کی حیثیت سے اس کو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبۂ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرا دی۔ یہ دور اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل Abstract Idea سے ترقی کر کے ایک مکمل نظامِ تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اس کی عملی صورت میں اور اس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہو جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اُسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جس کے خلاف وہ لڑ رہے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہوئے، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابوسفیان قائل ہوئے، قاتلِ حمزہ وحشی قائل ہوئے، ہندِ جگر خوار تک کو آخر اس شخص کی صداقت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اس کی نگاہ میں کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ آٹھ سال کی تمام لڑائیوں میں جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصان کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپ کے پیشِ نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریق

انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور اچکے تھے ان کا احساس دیانت اتنا نازک ہوگیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو نہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ ان کے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لیے پہنچا تا کہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اس کے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے۔ وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، اُن کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہوگیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہوگیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب اُن کا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو ایک معتد بہ رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اُٹھا لیں۔ اس نرالی تقسیم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار اُن کی زبانوں سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا

تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفۂ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دورانِ جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہکر اہلِ شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمھاری حفاظت سے قاصر ہیں، لہٰذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اُسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اُن میں وہ سفیر پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالارِ ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساواتِ انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہبِ انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت پڑ گیا ہوگا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جن کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی اُن کا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انھیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نہ پیش ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اُس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ سے میدانِ جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لاکر سپہ سالار کے سامنے رکھ دیتے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے۔ کہیں آپ کو کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ اس معمہ کو لوگ حل نہیں کر سکتے اس لیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون

ہوگیا ہے، اور کوئی اسے محض ایک خیالی آدمی (Visionary) قرار دے کر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کر دیتا۔ اُس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جن کی نگاہ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظامِ فکر پر ایک مکمل نظامِ حیات بن گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اس کے نتائج ان کے سامنے عیاناً آگئے تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ چیز تھی جس کو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہ رہا تھا۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اس کے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہوگیا۔

یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے یہی اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے، اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہوسکتا ہے، نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ تھا۔ اس میں علت و معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعورِ اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوتِ فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے ان جواں ہمّت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اُس پر پوری طرح نظر جمادیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کردیں، اپنی امیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائیٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے، اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

استدراک اوپر کے مضمون میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کی جو توضیح کی گئی ہے، اگرچہ وہ بجائے خود کافی ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے چند اقوال ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کر دیے جائیں جن سے اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہمارے موجودہ زمانے کے حالات اُن حالات سے بہت ملتے جُلتے ہیں جن میں سیدنا مسیح نے اہلِ فلسطین کو حکومتِ الٰہیہ کی دعوت دی اس لیے اُن کے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں :-

"فقیہوں میں سے ایک نے ... اُس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے، اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند[1] ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ ... فقیہ نے اس سے کہا اے استاد، کیا خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں" (مرقس۔ ۱۲: ۲۸-۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (لوقا ۴: ۸)

"پس تم اس طرح دعا مانگا کرو کہ اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو" (متی ۶: ۹-۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیح نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد محض روحانی بادشاہت تھی، یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ ان کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکمِ شرعی اسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اس کا قانونِ طبعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور آدمی کے دشمن

[1] "خداوند" اور "الٰہ" دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب[1] نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اُسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اُسے بچائے گا۔" (متی ۱۰: ۳۴-۳۹)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[2] سے انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے۔" (متی ۱۶: ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالہ کرے گا اور بیٹے کو باپ۔ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انھیں مروا ڈالیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔" (متی ۱۰: ۲۱-۲۲)

"دیکھو میں تمھیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں... آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمھیں عدالتوں کے حوالے کر دیں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمھارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔" (۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے[3] تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب اُٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب کرلے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہکر اس پر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا.. تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک

---

[1] اپنی صلیب آپ اٹھانے سے مراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے۔ جس طرح اُردو میں محاورہ ہے سر ہتھیلی پر لے کر نکلنا۔

[2] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراض ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔

[3] دشمنی کرنے سے مراد ان کی محبت اور اُن کے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر دینا ہے۔

نہ کر دے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا"۔ (لوقا ۱۴: ۲۶-۳۳)

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اٹھے تھے بلکہ پورے نظامِ تمدن و سیاست کو بدل دینا ان کے پیشِ نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار، اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا"۔ (متی ۵: ۳۹-۴۱)

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو بلکہ اسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے"۔ (متی ۱۰: ۲۸)

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو"۔ (متی ۶: ۱۹-۲۰)

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا...... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے...... اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے، اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے...... ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی

باوجود اپنی شان وشوکت کے ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ . . . . . تم پہلے اس کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمھیں مل جائیں گی۔" (متی ۶: ۲۴-۳۳)

مانگو تمھیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمھارے واسطے کھولا جائے گا۔" (متی ۷: ۷)

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی تھی۔ حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمل شدائد اور توکل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظامِ تمدن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اس کے قبضہ و اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اُٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال نہ دے، سختیاں اُٹھانے کو تیار نہ ہو جائے، اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ یہ کام جنھیں کرنا ہو انھیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے، کُرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیے۔ خزائن رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے لڑکر رزق پانے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا جو اسباب سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسہ پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی ان سے لڑ سکتا ہے۔

"اے محنت اٹھانے والو! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمھیں آرام دوں گا۔ میرا جُوا اپنے اوپر اُٹھا لو . . . . . کیونکہ میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔ (متی ۱۱: ۲۸-۳۰)

شاید حکومتِ الٰہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پُراثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

"غیر قوموں کے بادشاہ اِن پر حکومت چلاتے ہیں۔ اور جو ان پر اختیار رکھتے ہیں وہ خداوندِ نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند اور سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کے مانند بنے۔" (لوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

مسیح علیہ السلام یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا۔

"فقیہ اور فریسیؔ موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انھیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

"اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو، نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

"اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو

ؔ فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔

اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو"

"اے اندھے راہ بنانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے، تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔" (متی ۲۳: ۲-۲۸)

یہ اس وقت کے حاملان شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود محض بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

"اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انھوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انھوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے استاد ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔ . . . . . ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لائے اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انھوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو۔" (متی ۲۲: ۱۵-۲۱)

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے چاہتے تھے کہ حضرت مسیح کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کے جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اُسے کچلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی[1] کے سامنے یہ سوال اُٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں۔

---

[1] مسیح علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنت روم کی تابع فرمان تھی۔ اس کے بانی ہیرود کے نام پر اس کو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیٹیکل سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔

جواب میں حضرت مسیحؑ نے جو ذو معنی بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اس حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانہ میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیح علیہ السلام نے تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا ان کی دعوت کے خلاف تھا، اور نہ یہ فرمایا کہ اسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اس وقت تک ان کی تحریک اس مرحلہ تک نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا، اس لیے انھوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کردو، اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔

اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیحؑ کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیحؑ کو گرفتار کرائے جبکہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ اسکریوتی نے مسیحؑ کو پکڑوا دیا۔

"پھر ان کی ساری جماعت اُٹھ کر اسے پیلاطس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور انھوں نے الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا ...... پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کچھ قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دیکر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر ابھارتا ہے ...... وہ چلا چلا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلانا کارگر ہوا۔" (لوقا ۲۳: ۱-۲۳)

اس طرح دنیا میں مسیح علیہ السلام کا مشن ان لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو حضرت موسیٰ کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رو سے حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کا کل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدت میں انھوں نے اُتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکی زندگی کے ابتدائی دو تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا عبارات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکی سورتوں اور زمانۂ قیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔

ایک صالح جماعت کی ضرورت

دنیا میں اس وقت بڑے زور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا، اہل زمین کو محض ان کے کرتوتوں کی سزا ہی دینے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اس توڑ پھوڑ کے بعد کوئی صالح چیز بھی بننے والی ہے۔ مگر ظاہر آثار سے اتنا محسوس ہوتا ہے کہ نوع انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اس کی عمر پوری ہو چکی ہے، اُن کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پر آ لگا ہے، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ اُن کو اور ان کی اس جاہلی تہذیب کو دنیا کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے۔ اُن کو زمین پر کام کرنے کا جتنا موقع ملنا تھا، مل چکا۔ وہ اپنے تمام اوصاف، اور اپنی تمام چھپی ہوئی قابلیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ اُن کے اندر شاید اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جو باہر نہ آ چکی ہو۔ لہٰذا غالب گمان یہی ہے کہ عنقریب وہ میدان سے ہٹائے جانے والے ہیں، اور یہ زبردست شکست و ریخت اسی لیے ہو رہی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مراسم تجہیز و تدفین ادا کر دیں۔ اس کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں پھر ایک ظلمت کا دور شروع ہو جس طرح آخری اسلامی تحریک کے زوال اور موجودہ جاہلی تہذیب کی پیدائش کے درمیان گذر چکا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے دوران میں کسی نئی تعمیر کی صورت نکل آئے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت، قومی اجتماعیت (نیشنل سوشلزم) اور اشتراکیت (کمیونزم) کی جو طاقتیں اس وقت آپس میں متصادم ہیں، یہ دراصل الگ الگ تہذیبیں نہیں ہیں کہ ان کے درمیان انتخاب، اور ان میں سے بہتر کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہو۔ حقیقت میں یہ ایک ہی تہذیب کی تین شاخیں ہیں۔ ایک ہی تصور کائنات، ایک ہی تصور انسان، ایک ہی نظریۂ حیات، اور ایک ہی اساس اخلاق ہے جس پر ان تینوں کی تعمیر ہوئی ہے۔ انسان کو

حیوان سمجھنا، دنیا کو بے خدا فرض کرنا، علوم طبیعی سے انسانی زندگی کا قانون اخذ کرنا، اور اخلاق کی بنیاد تجربہ و مصلحت پر رکھنا، یہ ان سب کی مشترک بنیاد ہے۔ ان کے درمیان فرق صرف اس حیثیت سے ہے کہ اس جاہلی تہذیب نے سب سے پہلے فرد کی آزادی اور قوموں کی انفرادیت کا بیج بویا تھا جس سے قومی ریاستوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ جمہوریت پیدا ہوئی اور مدتہائے دراز تک انسانیت کو تباہ و برباد کرتی رہی، پھر جب اس کے ظلم و ستم سے انسانی مصائب حد کو پہنچ گئے تو اسی تہذیب نے اشتراکی انقلاب کو بطور علاج پیش کیا، مگر بہت جلدی ظاہر ہو گیا کہ یہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ تباہ کن ہے، آخر کار وہی تہذیب پھر ایک دوسری تجویز سامنے لائی جس کا نام فاشزم یا نیشنل سوشلزم ہے اور چند سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس ام الخبائث کا یہ آخری بچہ فتنہ انگیزی و شرر باری میں پہلے دونوں برخورداروں سے بھی بازی لے گیا ہے۔

اب دنیا کے لئے اُس تہذیب کو اور زیادہ آزمانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے جو آدمی کو جانور سمجھ کر، اور اُس جانور کو بے لگام فرض کر کے اپنا کام شروع کرتی ہے اور اس کے اندر جوع البقر سے لے کر بدترین قسم کی درندگی تک ہر وہ بیماری پیدا کر دیتی ہے جو آدمیت کے حق میں نہایت مہلک ہے۔ درحقیقت یہ پوری تہذیب اپنی تمام شاخوں سمیت عمر طبعی کو پہنچ چکی ہے، امتحان کی مدت ختم کر چکی ہے، اس کے پاس اب کوئی اولاد انچھر ایسا باقی نہیں رہا ہے جس کو یہ انسانی مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر سکے، اور بالفرض اگر یہ اپنی زندگی کی مہلت کے بڑھانے کے لئے کسی اور "ازم" کی تخلیق کا بہانہ کرے بھی تو خدا کی مشیت اب یہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اسے اپنی زمین کو فساد سے بھرنے کا کوئی اور موقع دے گا۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ تصادم کے بعد اس کی شاخوں میں سے کوئی شاخ باقی رہ جائے، مگر یقیناً اس کا بقاء عارضی ہو گا، جلدی ہی وہ شاخ خود چیخ کر اپنے اندر سے آگ جھاڑے گی اور آپ اپنی ہی آگ سے جل کر خاکستر ہو جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا اس تہذیب کی تباہی کے بعد دنیا میں پھر کوئی ظلمت کا دور آنا ہے یا کوئی نئی تعمیر شروع ہونی ہے، تو اس کا فیصلہ دو چیزوں پر منحصر ہے:

ایک یہ کہ جاہلیتِ خالصہ کی ناکامی کے بعد کوئی اور ایسا نظریہ انسان کو ملتا ہے یا نہیں جو پچھلے فاسد نظریوں سے بہتر ہو جس سے انسانی عقل صلاح کی توقعات وابستہ کر سکے اور جس پر ایک جاندار اور طاقتور تہذیب قائم ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ نوعِ انسانی میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جس کے اندر جہاد اور اجتہاد کی وہ صلاحیتیں اور قوتیں ہوں جو ایک نئے نظریے پر ایک نئی تہذیب کا قصر تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہیں، اور جس کے اخلاق و اوصاف اُن لوگوں سے مختلف ہوں جن کی خباثت و شرارت کا ابھی تجربہ ہی ہیں انسان کو تجربہ ہو چکا ہے۔

اگر ایسا کوئی نظریہ بروقت سامنے آ جائے اور اس کو لے کر ایسی ایک صالح جماعت اُٹھ کھڑی ہو تو یقیناً نوعِ انسانی ایک دوسرے دورِ ظلمت سے بچ سکتی ہے ورنہ کوئی قوت اس کو اس تاریک گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی یہ صدمۂ عظیم جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے، یہ بھیڑیوں سے بدتر سلوک جو اس وقت آدمی آدمی کے ساتھ کر رہا ہے، یہ بے دردی و سنگدلی جو کبھی دورِ وحشت میں بھی آدمی سے ظاہر نہیں ہوئی تھی، یہ بے رحمی و قساوت جس کی نظیر درندہ جانور بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں، یہ علم و حکمت کے نتائج جو آج جہاں سوز طیاروں اور انسان پاش ٹینکوں کی شکل میں دیکھے جا رہے ہیں، یہ تنظیمی قابلیتوں کے ثمرات جنھوں نے آج غارتگر فوجوں کی صورت اختیار کی ہے، یہ صنعتی ترقی کے پھل جو آج آلاتِ جنگ کی بھیانک شکل میں نمودار ہو رہے ہیں، یہ وسائل نشر و اشاعت کا کمال جس سے آج دنیا میں جھوٹ پھیلانے اور قوموں میں منافرت کے بیج بونے کا کام لیا جا رہا ہے، یہ سب کچھ انسان کا دل توڑ دینے اور اس کو اپنے آپ سے اور اپنی ساری قابلیتوں اور صلاحیتوں سے مایوس کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے، اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی دل شکستہ و مایوس ہو کر صدیوں کے لیے نیند اور بے ہوشی کی حالت میں مبتلا ہو جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں، انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور ایک صالح جماعت کا برسرِ کار آنا ہے۔

مگر وہ کونسا نظریہ ہو سکتا ہے جس کے لیے آج کامیابی کا کوئی موقع ہو؟

مشرکانہ جاہلیت جس پر دنیا کی بہت سی قدیم تہذیبیں قائم ہوئی تھیں، اب اس کے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ شرک کی جڑ کٹ چکی ہے۔ جاہل عوام پر چاہے اس کا تسلط ابھی باقی ہو، مگر علم و عقل رکھنے والے لوگ اب اس وہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کائنات کے نظام کو بہت سے خدا چلا رہے ہیں، اور انسانی فلاح و سعادت کا سر رشتہ دیوتاؤں یا ارواح سے وابستہ ہے۔ علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ مشرکانہ نظریہ سے انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل جس نے اس وقت دنیا کو پریشان کر رکھا ہے، نوع انسانی میں وحدت کا فقدان ہے۔ مگر شرک اس مشکل کو حل نہیں کرتا، بلکہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے مزید تفریق و تقسیم کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا کسی مشرکانہ نظریہ کیلیے آج دنیا میں برسر اقتدار آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

راہبانہ جاہلیت دنیا میں کبھی کوئی طاقت نہ تھی نہ بن سکتی ہے۔ کرما اور تناسخ اور اہنسا اور ہمہ اوست کے نظریات جو روح کو سرد اور ہمتوں کو پست اور قوائے فکر کو افیونِ تخیل کی پینک میں مست کر دینے والے ہیں، اپنے اندر اتنی جان ہی نہیں رکھتے کہ ان کے بل پر کوئی ایسی تہذیب پیدا ہو سکے جو زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہو اور دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصب جلیل پر فائز ہو سکتی ہو۔ کوئی سامری اس تنِ مردہ میں روح پھونکنے کی جتنی چاہے کوشش کر دیکھے، یہ نظریات کبھی گیان اتیاگ اور تپسیا کے مقام سے آگے بڑھ کر ایک صالح تمدن کی تخلیق اور ایک عادل مملکت کی تاسیس اور ایک درخشاں تہذیب کی تعمیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا مردہ اور رو بزوال قومیں تو ان نظریات کے چکر میں پڑی رہ سکتی ہیں مگر کسی زندہ اور ابھرنے والی قوم کے تخیل کو یہ کبھی اپنی طرف نہیں کھینچ سکیں گے

رہی جاہلیتِ خالصہ تو اس کا اور اس کی پیداوار کا اب دنیا کو اتنا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ عنقریب وہ اس سے مایوس ہونے والی ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو جانور فرض کرنا، جانوروں کی زندگی سے تنازع للبقاء اور انتخابِ طبیعی اور بقائے اصلح کا قانون اپنے لیے اخذ کرنا، مادی فوائد اور لذتوں کو مقصودِ حیات ٹھیرانا، تجربات اور مصالح کو اخلاق کا ماخذ قرار دینا، اور کسی فوق الانسانی اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنا جو کچھ نتائج پیدا کر سکتا تھا وہ سب اپنی تمام تلخیوں کے

سامنے آچکے ہیں۔ ان نظریات کی بدولت انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ قومی اور نسلی تعصبات ہیں، رنگ و نسل کی برتری کے دعوے ہیں، قومی ریاستوں کی معاشی و سیاسی رقابتیں ہیں، قیصریت اور استعمار اور معاشی لوٹ کے فتنے ہیں، افراد سے لے کر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں تک کا اپنے معاملات میں ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو جانا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا واقعی جانور بن کر کام کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا بلکہ بے روح مشینوں کا سا سلوک کرنا ہے۔ یہ نظریات اگر جمہوریت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو ظلم اور کسب حرام اور فحش اور بے حیائی کی آزادی ملتی ہے۔ اور اگر اشتراکیت یا اجتماعیت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو بھیڑ بکریوں کے گلّے کی طرح ایک ڈکٹیٹر یا ایک چھوٹی سی پارٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انھیں جس طرح چاہے ہانکے اور ان کا جو جی چاہے بنائے۔ یہ پھل جو ان نظریات سے پیدا ہوئے ہیں کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اس شجر خبیث کی عین فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے یہ پھل پیدا ہوں۔ لہٰذا جس طرح اب تک انسان اس سے کسی قسم کی فلاح نہیں پا سکا ہے اسی طرح آئندہ بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انسانیت کے اس حیوانی تصور اور کائنات کے اس مادہ پرستانہ نظریے اور اخلاق کی اس تجربی اور مصلحت پرستانہ بنیاد پر کوئی ایسا اجتماعی مسلک پیدا ہو سکے گا جو انسان کے لیے موجب فلاح ہو۔

ان سب نظریات کی ناکامی کے بعد دنیا اگر کسی نظریہ سے فلاح کی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہو سکتا ہے:

جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور، جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے، جس کا تصور انسانیت مغربی سائنس کے "تصور حیوانی" اور مسیحیت کے "پیدائشی گنہگار" اور ہندو مت کے "مجبور تناسخ" سے بلند تر ہو،

جو انسان کو مختار مطلق اور شتر بے مہار نہ بنائے بلکہ اُسے سلطان کائنات کے اقتدار اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے آگے ذمہ دار و جواب دہ ٹھیرائے،

جو اخلاق کے ایک ایسے قابل عمل ضابطے کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق رد و

بدل کرنے کا حق اس کو نہ ہو،

جو مادی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی وروحانی بنیاد فراہم کرے جس پر انسانیت متحد ہو سکتی ہو،

جو اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہو سکے،

جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے،

اور ان سب خصوصیات کے ساتھ جو علمی و عقلی اور تمدنی ارتقار میں انسان کی صرف مد دہی نہ کرے بلکہ صحیح رہنمائی بھی کرے اور مادی و اخلاقی، ہر دو حیثیتوں سے اسے ترقی کی طرف لے جائے۔

ایسا ایک نظریہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کونسا ہے؟ لہذا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے بنائے ہوئے تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کے لیے کامیابی کا اب کوئی موقع نہیں۔ اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نئے نظریہ کی تصنیف اور اس کی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت میں صرف اسلام ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جس سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے، جس کے لیے نوع انسانی کا دین بن جانے کا امکان ہے، اور جس کی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہو گا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائیں گے۔ ایک تہذیب کا سقوط اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتا کہ کل تھی اور آج ناپید ہو گئی۔ اور دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح واقع نہیں ہوتا کہ آج چٹیل میدان ہے اور کل کسی منتر کے زور سے ایک

عالی شان قصر بن کھڑا ہو۔ گرنے والی تہذیب کے افکار، اصول، طریقے مدتہائے دراز تک دلوں اور دماغوں پر، علوم و آداب پر اور تمدن و معاشرت پر اپنا اثر جمائے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استیصال خود بخود نہیں ہو جاتا، کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح گرنے والی تہذیب کے علمبردار بھی زوال پذیر ہونے کے باوجود سالہا سال تک زمین پر قبضہ جمائے رہتے ہیں۔ وہ خود جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے، ہٹانے سے ہٹتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ سہولت سے بیٹھے رہیں اور قصر خود بن جائے۔ اس کام کے لیے ایک زبردست تنقیدی، تخریبی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سر نو مدوّن کرے حتیٰ کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں، ایک طرف ان پرانے سانچوں کو ڈھائے جن پر انسانیت ڈھلا کرتی تھی اور دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن سے نئے اخلاق اور نئی سیرتوں کے آدمی ڈھلنے لگیں، ایک طرف پرانے نظامِ تمدن و سیاست کو بزور مٹائے اور دوسری طرف ایک پورا نظامِ تمدن و سیاست اپنے اصولوں پر عملاً قائم کر دے۔

پس دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی صورت سے دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود مطیع بنیں، جس ضابطہ پر ایمان لاتے ہیں اُس کے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اُسے خود چھوڑیں۔ اس کے بغیر تو ان کی صداقت آپ ہی مشتبہ ہو گی کجا کہ کوئی اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرے۔ پھر ان کو اس فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہو گی۔ اس سے اور اس کے پیرووں سے تعلق توڑنا ہو گا، اُن تمام فائدوں،

لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ اُن تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انھیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے پڑیں گے، اپنے دل ودماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا، اور قید اور جلا وطنی اور ضبطِ اموال اور تباہی اہل وعیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ اِن راہوں سے گذرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پُشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ، خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پھیلا سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اُس کے اصولوں کی طاقت جس قدر ضروری ہے، اُسی قدر اُن انسانوں کی سیرت، ان کے عمل اور اُن کی قربانی وسرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، مگر زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینہ سے، اور اپنی جفاکشی سے اس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اُگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اگرچہ خلوصِ ایمان اور قربانی وجاں فشانی ہر دین کے قیام کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل، مگر دینِ حق اُس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دینِ باطل کے قیام کے لیے درکار ہے۔ حق ایک ایسا باریک بیں صرّاف ہے جو ذرا سی کھوٹ کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا وہ خالص سونا چاہتا ہے۔ آزمائشوں کی بھٹی میں سے گذر کر جب تک ساری کھوٹ جل نہ جائے اور پورے عیار کا کندن نکل نہ آئے وہ اپنے نام سے اس کو بازار میں لانے کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق ہے،

باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سکے اور ملمع کیے ہوئے زیور بیچتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ۔ (آل عمران - ۱۸)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ نہ مانے گا جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے، چھوڑ دیے جائیں گے اور انھیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ان سے پہلے جو گزر چکے ہیں (یعنی جنھوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے) وہ ضرور تپائے گئے ہیں۔ ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (بقرہ - ۲۶)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گذری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گذر چکی ہے؟ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً (توبہ - ۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سستے چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنھوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا۔ اور اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ، وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ، اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ، وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (العنکبوت ۱)

اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے مگر جب اللہ کی راہ میں انھیں ستایا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ حالانکہ اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو یہی لوگ آ کر کہیں گے کہ ہم تو تمھارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہل دنیا کے دلوں سے خوب واقف نہیں ہے ؟ مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایماندار کون ہیں اور منافق کون۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ - ۱۹)

ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان و مال اور کمائیوں کے نقصانات سے آزمائیں گے اور کامیابی کی بشارت ہے اُن مستقل مزاج لوگوں کو جنھوں نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور آخر اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر اُن کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ راہ راست پانے والے ہیں۔

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ (محمد - ۱)

یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی خود نہیں کر سکتا اس لیے تم سے مدد مانگتا ہے۔ نہیں، وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں اُن کو تباہ کر کے رکھ دے اور اپنے دین کو خود قائم کر دے، مگر اس نے یہ جہاد اور محنت و قربانی کا بار تم پر اس لیے ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے۔ جب تک باطل پرستوں سے تمھارا تصادم نہ ہو، اور اس تصادم میں مصائب

ونشدائد اور خطرات و مہالک پیش نہ آئیں، سچے اہلِ ایمان جھوٹے مدعیوں سے ممیز نہیں ہو سکتے، اور جب تک ناکارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتھا نہیں بن سکتا جو خلافتِ الٰہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریۂ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریۂ حق تو موجود ہے، البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پر ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایمان دار، دُھن کے پکے اور اپنی ہر عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ اب کہاں مل سکتے ہیں، وہ تو بس ایک مبارک دور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ محض ایک وہم ہے اور ایسا وہم انہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنھیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور ہر صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں جہاں منافقانہ خصوصیات رکھنے والے اور ضعیف لارادہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں، وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ہٹلر اور جرمنی پر ایمان لائے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی خاطر ہوائی جہاز سے عین دشمن کے ملک میں جَست لگاتے ہیں جہاں ان کو معلوم ہے کہ بے شمار شکاری اُن کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ روس کا انقلاب جو ابھی چند بیس پچیس سال پہلے ہی کی بات ہے، اُس کی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہزارہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانیاں کرتے رہے، سائبیریا کے جہنم میں بھیجے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلاوطنی کی حالت میں برسوں ملک ملک کی خاک چھانتے پھرے، اپنی ذاتی خوش حالی کی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا خون کیا، خانماں بربادی کو خود اپنے ہاتھوں مول لیا، اور یہ سب کچھ اس وقت کیا جب کہ زار

کی سلطنت کے مٹنے کا تصور بھی مشکل ہی کیا جا سکتا تھا دور نہ جائیے. خود ہندوستان ہی کو دیکھ لیجیے، یہاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ کشت وخون کے ذریعہ سے وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکیں گے، انھوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی زندگیوں کو برباد کرنے اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی؟ کونسی ممکن التصور مصیبت ایسی تھی جسے انھوں نے برداشت نہ کیا ہو؟ قید خانوں میں شدید ترین اذیتیں اٹھائیں، حبس دوام میں عمریں گذار دیں، پھانسی کے تختہ پر جانیں تک دیدیں۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کے طریقے صحیح تھے یا غلط، مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اس کے لیے جان ومال اور شخصی امنگوں کی قربانی گوارا کرنے اور مصیبتیں سہنے کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں ہے۔ گاندھی جی کی سول نافرمانی ابھی حال ہی کی بات ہے۔ کیا اسی ہندوستان کے باشندوں میں ایسے لوگ موجود نہ تھے جنھوں نے لاٹھیاں کھائیں، جیل گئے اور مالی نقصانات برداشت کیے؟ کیا باردولی کے کسانوں نے اپنی زمینوں، اپنے جانوروں اور اپنے گھروں کے برتنوں تک کی قرقی اور نیلام کو صبر کے ساتھ برداشت نہیں کیا؟ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آج ایثار وقربانی کی وہ صفات انسانوں میں مفقود ہیں جو پہلے لوگوں میں پائی جاتی تھیں۔ اگر ہٹلر اور مارکس اور گاندھی پر ایمان لاکر انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے، تو کیا خدا پر ایمان لاکر کچھ نہیں کر سکتا؟ اگر خاکِ وطن میں اتنی کشش ہے کہ اس کے لیے آدمی جان ومال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا خدا کی رضا اور اس کے تقرب میں اتنی کشش بھی نہیں ہے؟ پس جو لوگ خود پست ہمت اور ضعیف الارادہ ہیں انھیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کارِ عظیم کے لیے جن اُولوالعزم انسانوں کی ضرورت ہے وہ کہیں مل ہی نہیں سکتے۔ البتہ اپنی ذات کی حد تک وہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُونَ۔

جماعتِ اسلامی کی تشکیل

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا جاچکا ہے، اس سے چار حقیقتیں پوری طرح واضح ہوجاتی ہیں:

ایک یہ کہ اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بنیادی طور پر بدل دینا ہے،

دوسرے یہ کہ یہ کلّی و اساسی تغیر صرف اُسی طریقہ پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا،

تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ نہ اس مقصد کے لیے ہے اور نہ اس طریقہ پر ہے،

چوتھے یہ کہ اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں اسلامی جماعت ہو اور اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریقہ پر کام کرے۔

میں نے اور میرے ہم خیال لوگوں نے کامل تین سال اس امر کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں جو بڑی بڑی جماعتیں اس وقت قائم ہیں وہ سب یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک اپنے نظام اور پروگرام میں ایسی تبدیلی کرلے جس سے اسلام کی یہ ضرورت پوری ہوجائے اور ایک نئی جماعت بنانے کی حاجت باقی نہ رہے، مگر افسوس کہ ہمیں اپنی اس کوشش میں پوری ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ان لوگوں کو جمع کریں جو موجودہ جماعتوں کے طرزِ عمل سے غیر مطمئن اور صحیح اسلامی اصول پر کام کرنے کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ شعبان ۱۳۶۰ھ (اگست ۱۹۴۱ء) میں ہم نے ان لوگوں کا اجتماع منعقد کیا اور باہمی مشورہ سے جماعتِ اسلامی قائم کی[1] جس کا دستور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

---

[1] اس جماعت کی روداد علیحدہ شائع ہوچکی ہے اور ۱۲/ کے ٹکٹ بھیج کر دفتر رسالہ ترجمان القرآن سے مل سکتی ہے۔

دستورِ جماعتِ اسلامی

عقیدہ

۱۔ جماعتِ اسلامی کا بنیادی عقیدہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ یعنی صرف اللہ ہی ایک الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

تشریح :۔ اس عقیدے کے پہلے جز یعنی اللہ کے الٰہ واحد ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان، اور جو کچھ آسمان وزمین میں ہے، سب کا خالق، پروردگار، مالک، مدبر اور حاکم صرف اللہ ہے، ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ: انسان[۱] اللہ کے سوا کسی کو ولی و کارساز حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور حامی وناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہی نہیں ہے۔[۲] اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک وہی اکیلا ہے۔[۳] اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے، کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش سے قضاء الٰہی ٹل سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔[۴] اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر[۱] نہ دے

---

[۱] نذر اور ہدیہ میں اصولی فرق ہے۔ نذر یا تو اعترافِ نعمت کے طور پر کسی ایسی ہستی کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس کے منعم ہونے کا تصور آدمی کے ذہن میں ہوتا ہے۔ یا پھر اعترافِ بالاتری کی حیثیت سے کسی (باقی اگلے صفحہ پر)

اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ اللہ[8] کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک، مقتدرِ اعلیٰ نہ تسلیم کرے، کسی کو باختیارِ خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو شارع اور قانون ساز نہ مانے، اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کردے جو ایک اللہ کی اطاعت کے ماتحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک، اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے، اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدہ کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ: انسان[7] اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہشِ نفس کی بندگی چھوڑ دے، اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔ اپنے[8] آپ کو کسی چیز کا مالکِ مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز، حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضاء، اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔ اپنے[8] آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اسے اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔ اپنی[9] پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔ اللہ[10] کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔ اپنے[11] لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت اور صرف اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطہ کو ضابطہ تسلیم کرے، اور ہر اس طریقہ کو رد کردے جس کا اللہ کی طرف سے ہونا ثابت نہ ہو۔

(بقیہ سابق) ایسے شخص کے حضور میں گذرانی جاتی ہے جسے آدمی مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرتا ہے۔ بخلاف اس کے ہدیہ ایک انسان دوسرے انسان کو مخلصانہ محبت کی بنا پر دیتا ہے اور اس میں اعترافِ نعمت یا اعترافِ بالاتری کا کوئی تصور شامل نہیں ہوتا۔ اسی لیے اسلام میں ہدیہ جائز اور نذر لغیر اللہ حرام ہے۔

اس عقیدہ کے دوسرے جزء یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سلطان کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا، اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ: انسان ہر اُس تعلیم اور ہر اُس ہدایت کو بے چون وچرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ اُس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسولِ خدا سے ثابت ہے۔ اِس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت موقوف نہ ہو۔ رسولِ خدا کے سوا وہ کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے، دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے تحت ہو نہ کہ اس سے آزاد۔ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اُسے اختیار کرے، جو اس کے خلاف ہو اُسے ترک کر دے، اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اُسے حل کرنے کے لیے اسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی۔ کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولِ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آجائے یا اس کی مدمقابل بن جائے۔ رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اُس معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اُسی درجہ میں رکھے۔

نصب العین

۲۔ جماعتِ اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور

آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

تشریح :۔ جہاں تک امرِ تکوینی کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کی حکومت آپ اپنے زور پر قائم ہے اور اس سے بالاتر ہے کہ معاذ اللہ اُس کا قیام و بقا بندوں کی مدد کا محتاج ہو۔ تمام مخلوقات خواہ ارضی ہوں یا سماوی اس کے قہر و غلبہ سے مغلوب ہیں، اس کے زبردست قانون کی بندش میں جکڑی ہوئی ہیں، کسی میں اس کے حکم سے سرتابی کا یارا نہیں، اور دوسری مخلوقات کی طرح انسان بھی، خواہ مومن ہو یا کافر، اللہ کی تکوینی حکومت کے تحت محض ایک بندۂ مجبور ہے۔ لہٰذا حکومتِ الٰہیہ کے قیام سے مراد اللہ کی تکوینی حکومت کا قیام نہیں ہے۔ بلکہ دراصل اس سے مراد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے جس کا تعلق صرف انسان سے اور انسان کی زندگی کے بھی اس حصہ سے ہے جس میں اللہ نے انسان کو اختیار عطا کیا ہے۔

انسان کی زندگی کا جو حصہ حیوانی و طبعی ہے اس کو تو اللہ تعالیٰ نے حکمِ تکوینی کے ماتحت رکھا ہے، اور اس حصہ میں انسان دوسری تمام مخلوقات کی طرح بہرحال مسلم (مطیع) ہے، مگر جو حصہ انسانی ہے یعنی جس میں انسان عقل اور تمیز استعمال کر کے خود اپنے ارادہ سے کام کرتا ہے، اس میں اللہ نے اُسے آزادی عطا کی ہے کہ چاہے خود مختار بن کر کام کرے، چاہے اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ بن جائے، چاہے خود خدائی کا مدعی بن کر دوسروں کو اپنا بندہ بنائے، اور چاہے تو اپنے اصلی مالک کو پہچان کر برضا و رغبت اس کی بندگی اختیار کرے۔ یہ آزادی جو اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی ان چاروں صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کرے گا وہ یکساں جائز اور حق ہوگی۔ نہیں، اس انتخاب و اختیار میں آدمی کو آزاد چھوڑنے کا مدعا دراصل امتحان اور آزمائش ہے۔ جائز اور حق تو صرف یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی اُسی طرح اپنے خالق کا مطیع ہو جس طرح وہ اپنی زندگی کے غیر اختیاری حصہ میں اس کا مطیع ہے، کیونکہ حقیقت میں وہی ایک جائز فرماں روا ہے اور اسی کی اطاعت کائنات کے مجموعی نظام کے ساتھ صحیح مناسبت رکھتی ہے، لیکن اللہ نے اِس طریقِ حق پر چلنے کے لیے انسان کو مجبور نہیں کیا،

بلکہ اسے آزاد چھوڑ دیا تاکہ اگر وہ حق کو پہچانے اور آزادی رکھنے کے باوجود خود اپنی خوشی سے بندگی کا طریقہ اختیار کرے تو اسے ابدی انعام سے سرفراز کیا جائے، اور اگر وہ اسے نہ پہچانے یا پہچاننے کے باوجود خواہشاتِ نفس کا ایسا غلام ہو کہ مالکِ حقیقی کی اطاعت گوارا نہ کرے تو اس کو ابدی سزا دی جائے۔

چونکہ اس امتحان و آزمائش کی غرض سے اللہ نے انسان کو خود آزادی عطا فرمائی ہے اس لیے وہ اپنی فرماں روائی کا حق تسلیم کرانے کے لیے اپنی اُس قاہرانہ طاقت سے کام نہیں لیتا جس کو وہ اگر چاہتا تو پہلے ہی استعمال کر سکتا تھا اور چاہے تو ہر وقت استعمال کر سکتا ہے۔ جبر و زور سے مغلوب کرنے کے بجائے وہ حجت و برہان کے ساتھ نصیحت و فہمائش کرنے کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انسان کو سمجھاتا ہے کہ درحقیقت زمین و آسمان کا مالک مَیں ہوں، تُو میری مخلوق اور میری رعیّت ہے اور تیرے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ جو امرِ واقعی ہے اس کو تسلیم کر کے تو میرا مطیع و فرماں بردار بندہ بن جائے۔ اس فہمائش کے کام میں اللہ نے سب سے پہلے تو اُن انسانوں سے مدد لی ہے جن کو اس نے اپنا رسول مقرر کیا تاکہ وہ دلائل سے انسان کو حقیقتِ نفس الامری (یعنی اللہ واحد ہی کے تنہا مالک و مدبرِ کائنات اور حاکمِ ذی اقتدار ہونے) کا یقین دلائیں اور بطوع و رغبت اس کی اطاعت اختیار کرنے پر راضی کریں۔ پھر جو انسان رسولوں کی فہمائش سے حقیقت کو جان گئے ہوں اور جان کر اس کے پیرو بن چکے ہوں اُن سے اللہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم اس کام میں میری مدد کرو۔ چنانچہ قرآن میں بار بار فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ	اے ایمان لانے والو اللہ کے مددگار بنو۔
إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ	اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔
وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ	اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اُس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے، درآں حالے کہ اللہ پردۂ غیب میں چھپا ہوا ہے۔
وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ	اللہ ضرور ہی اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا۔

پس اللہ کی معبودیت وحاکمیت کا اقرار کرکے، اور اُس کی بندگی واطاعت اختیار کرکے مومن کا کام ختم نہیں ہوجاتا۔ بلکہ اس کے بعد یہ خدمت اس کے سپرد کی جاتی ہے کہ وہ جاہل انسانوں کو اسی حقیقت سے آگاہ کرے جس سے وہ خود آگاہ ہوا ہے، اور باغی انسانوں کو اسی رب کی بندگی اور اُسی حاکمِ اعلیٰ کی اطاعت پر آمادہ کرے جس کا وہ خود بندہ اور مطیع بنا ہے۔ اسی خدمت کی انجام دہی میں اللہ کی رضا ہے، اور اسی کے لیے اللہ اور مومن کے درمیان وہ معاہدہ عمل میں آتا ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ، يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ، وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ، وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ - ۱۴)

درحقیقت اللہ نے (اپنے کام کے لیے) مومنوں سے ان کی جانوں اور اُن کے مالوں کو خرید لیا ہے جس کے معاوضہ میں اُن کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں (اور اس لڑائی میں) مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں (اس کے معاوضہ میں جنت کا) وعدہ اللہ کے ذمہ ہے اور یہ پکا وعدہ ہے جو توراۃ اور انجیل اور قرآن میں کیا گیا ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے، لہٰذا اپنی اس بیع پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ کے ساتھ طے کی ہے کہ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

انسان کی زندگی کے اختیاری حصہ میں اللہ کے جس قانون کی اطاعت مطلوب ہے وہ اس کا قانون تکوینی نہیں ہے بلکہ اُس کا وہ قانونِ شرعی ہے جو رسولوں کے واسطہ سے آتا ہے اور اس قانون کا تعلق عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن اور سیاست وغیرہ سے ہے۔ محض تکوینی حیثیت سے اللہ کو خالق اور مدبرِ کائنات اور مالکِ ارض وسماوات مان لینا کافی نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے اسی کو بادشاہ، اور حاکم اور قانون ساز ماننا بھی ضروری ہے اور اسی کے بنائے ہوئے اصولِ اخلاق اور حدودِ قانون کی پیروی لازم ہے۔ اگر صرف تکوینی حیثیت سے کوئی اللہ کو مانتا ہو اور لاشریک مانتا ہو، لیکن انسانی زندگی کے اختیاری حصہ میں خود اپنے مختارِ مطلق ہونے کا ادعا

کرے، یا زمین کے کسی حصہ پر اپنی حاکمیت کا مدعی ہو اور کہے کہ یہاں میں اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہوں گا حکومت چلاؤں گا (جیسا کہ نظام بادشاہی میں ہر بادشاہ، نظام آمریت میں ہر ڈکٹیٹر، نظام برہمنی و پاپائی میں ہر مذہبی پیشوا، نظام جمہوری میں جمہوریت کا ہر شہری کہتا ہے، اور جیسا کہ انفرادی زندگی میں ہر اُس شخص کا نفس کہتا ہے جو خدا کی اطاعت کا قائل نہ ہو) تو دراصل وہ خدا کے مقابلہ میں بغاوت کرتا ہے۔ اور علی ہذا القیاس جو شخص اس شعبۂ زندگی میں کسی دوسرے کی حاکمیت و آمریت تسلیم[1] کرتا ہے وہ بھی بغاوت ہی کا ارتکاب کرتا ہے۔ مومن کا کام اس بغاوت کو دنیا سے مٹانا اور خدا کی زمین پر خدا کے سوا ہر ایک کی خداوندی ختم کر دینا ہے۔ مومن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جس طرح خدا کا قانونِ تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اُسی طرح خدا کا قانونِ شرعی بھی عالمِ انسانی میں نافذ ہو۔ مومن کی تمام مساعی کا ہدفِ مقصود یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا ہر ایک کی بندگی سے نکالے اور صرف خدا کا بندہ بنائے۔ یہ کام فی الاصل تو نصیحت، فہمائش، ترغیب اور تبلیغ ہی سے کرنے کا ہے لیکن جو لوگ ملک خدا کے ناجائز مالک بن بیٹھتے ہیں اور خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں وہ عموماً اپنی خداوندی سے محض نصیحتوں کی بنا پر دست بردار نہیں ہو جایا کرتے، اور نہ وہ اس کو گوارا کرتے ہیں کہ عامۃ الناس میں حقیقت کا علم پھیلے، کیونکہ اس سے ان کو خطرہ ہوتا ہے کہ ان کی خداوندی خود بخود ختم ہو جائے گی، اس لیے مومن کو مجبوراً جنگ کرنی پڑتی ہے تاکہ حکومت الٰہیہ کے قیام میں جو چیز سدّ راہ ہو اُسے راستہ سے ہٹا دے۔

نظامِ جماعت

۳- ہر وہ شخص (خواہ مرد ہو یا عورت اور خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ کا باشندہ ہو) جو عقیدہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ کر شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے، وہ اس جماعت کا رکن ہو سکتا ہے۔ اس شہادت

---

[1] تسلیم کرنے سے مراد اس کو جائز اور صحیح تسلیم کرنا ہے۔

کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔

تشریح :- اس جماعت میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں کر لیا جائے گا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہو گا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آ سکتا[1]۔ اس دائرے میں آنے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمۂ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو، وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا، اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور یہ شہادت اس کے طرزِ خیال اور طرزِ زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنے کی جرأت کرے صرف وہی اس جماعت میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ نسلاً غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور اب پورے فہم و شعور کے ساتھ اپنے سابق ایمان کی تجدید کرے۔

۴۔ ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات ہر رکنِ جماعت کو اپنی زندگی میں لازماً کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں :-

(ا) فرائض کو ان کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے،

(ب) کبائر سے اجتناب کرے اور اگر نادانستہ کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے،

(ج) اگر وہ کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیتِ فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے، مثلاً سود، شراب، زنا، رقص و سرود، شہادتِ زور، رشوت، خیانت، قمار، قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ، تو اس کو ترک کر دے، بلا اس لحاظ کے کہ اس کے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو، اور اگر اس کی معاش میں ان وسائل کا

---

[1] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ایسے لوگوں کو مسلمان نہیں سمجھتے، بلکہ صرف یہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے جو جماعت ہم بنا رہے ہیں اس میں شامل ہونے کے لیے اس قسم کے مسلمان مفید نہیں ہیں۔

کچھ حصہ شامل ہو تو وہ اس حصہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے،

(ی) اگر اس کے قبضہ میں ایسا مال (یا جائداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو، یا جس میں حقداروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دست بردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے[1]،

(ک) اگر وہ کسی ایسی حکومت کا صدر یا رئیس، یا گورنر، یا وزیر یا جج ہو جو زمین کے کسی حصہ پر حاکمیت (Sovereignty) کی مدعی ہو تو اپنے اس منصب سے دست بردار ہو جائے،

(ل) اگر وہ کسی مجلس قانون ساز کا رکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ جو مجلس قرآن اور سنت رسول کو اساس اور منبع قانون تسلیم نہ کرے، اسلام کی رو سے اس کو انسانی زندگی کے لیے قوانین بنانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور اس کی رکنیت قبول کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہے،

(م) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہو تو اس کو واپس کرے اور اُن وفاداریوں اور نیازمندیوں سے باز آئے جن کی بدولت اُس نے خطاب پایا تھا یا جن کو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے نباہنا پڑتا ہے۔

یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت میں نہ لیا جائے گا، یا لیا جا چکا ہو تو خارج کیا جائے گا۔

۵۔ ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات ہر رکن جماعت کو بتدریج اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:۔

(۱) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت (غیر اسلام) کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت ہو جائے،

---

[1] یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا ہو گا جہاں حقدار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں اُن کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورت دیگر صرف توبہ اور آئندہ کے لیے طرز عمل کی اصلاح کافی ہو گی۔

(ب) تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر، خیال اور عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھال لینا، اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار، اور اپنی وفاداریوں کے محوّر کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا اور اپنی خود سری اور نفس پرستی کے بُت کو توڑ کر تابع امر رب بن جانا،

(ج) ان تمام رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کے خلاف ہوں، اور اپنے ظاہر و باطن کو احکام شریعت کے مطابق بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا،

(د) اُن تعصبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو، اور ان مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جن کی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو،

(ہ) فاسقین و فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا،

(و) اُن تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جن کا مقصد حاکمیت رب العالمین کے اثبات و قیام کے سوا کچھ اور ہو، (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و موادعت کے معاملات کیے جا سکتے ہیں، مگر یہ افراد کا کام نہیں بلکہ جماعت کا کام ہے۔ کوئی رکن جماعت انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جزء نہیں بن سکتا)

(ز) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی، اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا،

(ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیام حکومتِ الٰہیہ کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی ضروریات زندگی کے سوا اُن تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں،

ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجہ پر ہوں، مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر "جماعت اسلامی" میں آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

۶۔ جو لوگ غیر الٰہی نظامِ حکومت کو چلانے میں آلہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں یا غیر الٰہی قانون کے

اجزاء میں مددگار بنتے ہیں اُن کی تین حیثیتیں ہیں :-

اگر وہ اپنے اس کام پر خوش اور مطمئن ہیں اور اپنے اس کسب کو حلال وطیب سمجھتے ہیں اور اسی راہ میں ترقی درجات کے متمنی ہیں تو اُن کے لیے اس جماعت کے دائرے میں کوئی جگہ نہیں۔

اگر وہ اس نظام کو غلط اور اپنے اس کسب کو حرام سمجھتے ہیں، مگر اعتراف گناہ کے باوجود اس کو محض ضعفِ ایمان کی وجہ سے ترک نہیں کر سکتے، تو وہ اس جماعت میں داخل ہو سکتے ہیں اور اُن کا شمار تیسرے درجہ کے ارکان میں ہوگا جس کی تشریح آگے آتی ہے۔

اگر وہ محض اس مجبوری سے اس نظام میں منسلک ہیں کہ دوسرا ذریعۂ زندگی نہیں پاتے، اور نیک نیتی کے ساتھ اس بات کے لیے تیار ہوں کہ دوسرا ذریعہ پاتے ہی اُسے ترک کر دیں گے، تو وہ بھی جماعت میں داخل ہو سکتے ہیں اور ان کا شمار دوسرے درجہ کے ارکان میں ہوگا جیسا کہ آگے آتا ہے۔

تشریح :- یہ واضح رہے کہ غیر الٰہی نظام اطاعت کے ایک جزء اور دوسرے جزء میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے جو اجزاء بظاہر بالکل معصوم نظر آتے ہیں وہ بھی اسی قدر ناپاک ہیں جس قدر دوسرے غیر معصوم اجزاء۔ نیز جو غیر الٰہی نظام اطاعت مسلمانوں کی خداوندی میں چل رہا ہے وہ بھی اپنے تمام اجزاء سمیت اسی حکم میں ہے۔ مسلمان کی خداوندی اس کو ہرگز کوئی سندِ طہارت عطا نہیں کرتی۔

۷۔ جہاں ایک شخص حسب قاعدہ جماعت میں داخل ہو اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے حلقۂ تعارف میں بندگانِ خدا کو بالعموم جماعت کے عقیدے اور نصب العین کی طرف (جس کی تشریح دفعۂ اول و دوم میں کی گئی ہے) دعوت دے اور جو لوگ اس عقیدے اور نصب العین کو قبول کر لیں انھیں قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے لئے جدوجہد کرنے پر اکسائے۔ جماعت کے نظام میں شامل ہونے کی دعوت کسی کو نہ دی جائے، البتہ جو شخص خود اس جماعت کے عقیدہ و نصب العین سے متفق اور اس کے نظام و طریقِ کار سے مطمئن ہو کر اس میں داخل ہونے پر آمادہ ہو اُسی رُکن بنا لیا جائے۔ جہاں کم از کم دو رکن موجود ہوں وہاں مقامی جماعت قائم کر لی جائے اور مرکز کو اطلاع

دے کر ہدایات حاصل کی جائیں۔

۸۔ اس جماعت میں آدمی کے درجہ و مرتبہ کا تعین اس کے حسب و نسب اور علمی اُسناد اور مادّی حالات کے لحاظ سے نہ ہوگا بلکہ اُس تعلق کے لحاظ سے ہوگا جو وہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے ساتھ رکھتا ہو۔ اور جماعت کو اس کے اس تعلق کا ثبوت اُس کی اُن نفسی، جسمانی اور مادی قربانیوں سے ملے گا جو وہ اللہ کے دین کی راہ میں کرے گا۔

جماعت کے اندر ایسے لوگ اول درجہ میں شمار کیے جائیں گے جو تن، من، دھن سے شریکِ جماعت ہوں، اسلامی نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں ہر قربانی کے لیے تیار رہیں۔ اپنے آپ کو بلا کسی احتفاظ و استثنار کے اس طرح جماعت کے حوالے کریں کہ جب ان کو پکارا جائے، لبیک کہیں، جو خدمت ان کے سپرد کی جائے، انجام دیں، اور جان، مال، اولاد، عزیز، اقارب، دوست غرض کسی چیز کو بھی مقصدِ اسلامی سے عزیز تر نہ رکھیں۔ احکام شرعیہ کی پابندی میں رخصت کے بجائے عزیمت کے طریقہ پر عامل ہوں۔ غیر الٰہی نظامِ حکومت کے ساتھ ناگزیر تمدنی ضروریات کے ماسوا کسی قسم کا اختیاری تعلق نہ رکھیں۔ غیر الٰہی عدالت میں مُستغیث یا مدعی کی حیثیت سے نہ جائیں (بجز شدید اضطراری حالات کے جن میں بشرطِ امکان امیرِ جماعت سے اجازت لے لی گئی ہو) اور مدعی علیہ یا مستغاث علیہ کی حیثیت سے صرف ایسے حالات میں جائیں جبکہ غیر معمولی نقصان کا اندیشہ ہو۔ ایسے لوگ اپنے عہد میں پوری طرح صادق سمجھے جائیں گے، یہی جماعت کے اصل کارکن و کارفرما لوگ ہوں گے اور رہنمائی و سربراہ کاری انہی کے ہاتھ میں ہوگی۔

جو ارکانِ جماعت اپنے آپ کو جماعت کے کام میں بالکلیہ وقف نہ کریں، نہ خطرات اور قربانیوں کا پورا بار اُٹھائیں، نہ غیر الٰہی نظام سے درجہ اول کے لوگوں کی طرح قطع تعلق کریں، مگر احکامِ دین کی پوری اطاعت کرتے رہیں، اُن وسائلِ کسبِ رزق اور مشاغل سے مجتنب رہیں جو براہِ راست دینِ حق کے خلاف ہیں، صدقِ دل سے جماعت کے خیر خواہ و وفادار ہوں، اور اپنے وقت اور اپنے مال اور اپنی قوتوں کا ایک حصہ اپنی ذات کی خدمت سے بچا کر خدا کی راہ میں وقف کر دیں اُن کا شمار دوسرے درجہ کے ارکان میں ہوگا۔

جو لوگ جماعت کے عقیدہ ونصب العین اور اس کے مقتضیات کو اصولی حیثیت سے تسلیم کریں اور اس دستور کی دفعہ سوم و چہارم کے مطابق رکنیت کی لازمی شرائط بھی پوری کر دیں، مگر غیر الٰہی نظام سے ان کے جو مفاد وابستہ ہیں اُن کا نقصان گوارا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، یا جماعت کے کاموں میں کسی خاص سرگرمی کا اظہار نہ کریں اور اپنی حیثیت کے مطابق مال، وقت اور قوت اس راہ میں صرف نہ کریں، اُن کا شمار تیسرے درجے کے ارکان میں ہوگا اور وہ بس جماعت کے ہمدرد سمجھے جائیں گے۔

عورتوں کی حیثیت

۹۔ جو عورتیں جماعتِ اسلامی میں داخل ہوں اُن پر دفعہ چہارم اور دفعہ پنجم کے تمام اُن اجزاء کا اطلاق ہوگا جو مخصوص طور پر مردوں سے متعلق نہیں ہیں۔

۱۰۔ رکنِ جماعت ہونے کی حیثیت سے عورتوں کے فرائض حسب ذیل ہوں گے :۔

(ا) اپنے خاندان اور اپنے حلقۂ تعارف میں اس جماعت کے عقیدہ ونصب العین کی دعوت پہنچائیں۔

(ب) اپنے شوہروں، بھائیوں اور خاندان کے دوسرے مردوں پر بھی اس کی تبلیغ کریں۔

(ج) اپنے بچوں کے دلوں میں نورِ ایمان پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

(د) اگر ان کے شوہر یا بیٹے یا باپ اور بھائی جماعت میں داخل ہوں تو اپنی صابرانہ رفاقت سے اُن کی ہمت افزائی کریں اور جماعت کے نصب العین کی خدمت میں حتی الامکان انکا ہاتھ بٹائیں اور نزولِ مصائب کی صورت میں صبر و ثبات سے کام لیں۔

(ہ) اگر اُن کے شوہر یا اولیاء جاہلیت میں مبتلا ہوں حرام کھاتے ہوں یا معاصی کا ارتکاب کرتے ہوں تو صبر کے ساتھ ان کی اصلاح کے لیے ساعی رہیں، اُن کی حرام کمائی سے اور اُن کی ضلالتوں سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں اور ان کے ایسے احکام ماننے سے انکار کر دیں جو معصیتِ خدا و رسول کے مترادف ہوں بلا لحاظ اس کے کہ ان کی حکم عدولی کے نتائج کیسے ہی بُرے ہوں۔

امارت

۱۰۔ اس جماعت کا ایک امیر ہوگا جس کی حیثیت "امیر المومنین" (باصطلاح معروف) کی نہ ہوگی بلکہ صرف اس جماعت کے

رہنما کی ہوگی۔ اس کی اطاعت فی المعروف جماعت کے کل افراد اپنے امیر (باصطلاحِ شرعی) کی حیثیت سے کریں گے۔ امیر کے انتخاب میں تقویٰ، علمِ دین میں بصیرت، اصابتِ رائے، عزم و حزم اور مفادِ جماعت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ جماعت کی نظر میں انتخاب کے وقت جو شخص بھی مذکورہ بالا اوصاف کے لحاظ سے اہل تر ہوگا اس کو وہ اس منصب کے لیے منتخب کرے گی۔

امیر کی خدا ترسی و احساسِ ذمہ داری سے یہ توقع کی جائے گی کہ اپنے سے زیادہ اہل آدمی کے آجانے پر وہ خود اس کے لیے جگہ خالی کر دے گا۔ نیز ایسی صورت میں جبکہ جماعت اپنے نصب العین کے مفاد کے لیے ضرورت محسوس کرے، وہ امیر کو معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

ابتدائی لائحہ عمل

۱۱۔ جماعت کا ابتدائی پروگرام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک طرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں، اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہوں (خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا ایسے مسلمان ہوں جو اپنے دینی فرائض اور دینی نصب العین سے غافل ہیں) اُن کو بالعموم حاکمیتِ غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیتِ رب العالمین کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں۔ اس دعوت کی راہ میں جب تک کوئی قوت حائل نہ ہو، ان کو چھیڑ چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی قوت حائل ہو، خواہ وہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنی ہوگی اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔

بعد کے مراحل کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسے حالات پیش آئیں گے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائے گا۔ البتہ لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مضبوط جمے ہوئے اور زمین پر چھائے ہوئے دین (نظامِ اطاعتِ غیر اللہ) کو اُکھاڑ کر دوسرے دین (نظامِ اطاعتِ الٰہی) کو قائم کرنا بہرحال آسان کام نہیں ہے۔ اس میں جان، مال اور ہر چیز کا زیاں ہے، لہٰذا وہی لوگ آگے بڑھیں جو تمام فائدوں اور آسائشوں کی قربانی اور تمام نقصانات کی برداشت کے لیے تیار ہوں۔

یہ کتاب اُس کاغذ پر طبع ہوئی ہے جو ہمیں بحسن تعاون ایم ثناء اللہ خان بک سیلر پبلشر۔ لاہور حاصل ہوا۔

مرکنٹائیل پریس لاہور میں چھپی